حقوق و فرائض

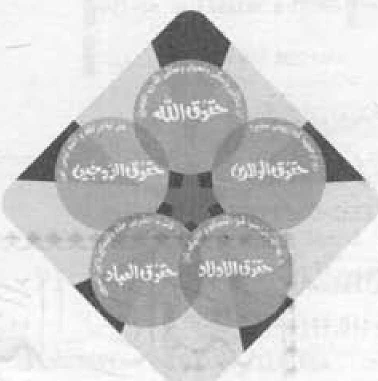
پُرامن اور خوبصورت معاشرے کی بنیاد



حافظ صلاح الدین یوسف

حقوق و فرائض

پُرامن اور خوبصورت معاشرے کی بنیاد



© مكتبة دارالسلام ١٤٢٧ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
يوسف ، حافظ صلاح الدين
الحقوق والفرائض باللغة الاردية / حافظ صلاح الدين يوسف - الرياض، ١٤٢٧ هـ
ص: ٢٥٠ مقاس: ١٤×٢١ سم
ردمك: ٢-٦-٩٨٢٢-٩٩٦٠
١-الفضائل الاسلامية ٢-العبادات أ-العنوان
ديوي ٢١٢،٢ ١٤٢٧/٥٦٢٣
رقم الإيداع: ١٤٢٧/٥٦٢٣
ردمك: ٢-٦-٩٨٢٢-٩٩٦٠

دارالسلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

سعودی عرب (ہیڈ آفس)
پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4043432-4033962 1 00966 فیکس: 4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com
Website: www.darussalam.com

● طریق مکہ - العلیا - الریاض فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 ● الملز - الریاض فون: 4735220 فیکس: 4735221
● سویلم فون: 2860422 1 00966 ● جدہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270
● مدینہ منورہ موبائل: 503417155 00966 فیکس: 8151121 ● خمیس مشیط فون: 2207055 7 00966 موبائل: 0500710328
● الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 ● ینبع البحر موبائل: 0500887341

شارجہ فون: 5632623 6 00971 **امریکہ** ❶ ہوسٹن فون: 7220419 713 001
لندن فون: 4885 539 208 0044 ❷ نیویارک فون: 6255925 718 001

پاکستان (ہیڈ آفس و مرکزی شوروم)
❶ 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور
فون: 7110081-7111023-7232400-7240024 42 0092 فیکس: 7354072
Website: www.darussalampk.com E-mail: [illegible]
❷ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703 ... 7846714
کراچی شوروم Z-110,111 (D.C.H.S) مین طارق روڈ کراچی
فون: 4393936 21 0092 فیکس: 4393937
Email: darussalamkhi@darussalampk.com
اسلام آباد شوروم F-8 مرکز، اسلام آباد فون: 051-2500237

حقوق و فرائض

پُر امن اور خوبصورت معاشرے کی بنیاد

تحقیق و تخریج سے مزین ایڈیشن



حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ہیوسٹن • نیو یارک

نامِ کتاب : حقوق و فرائض

مصنّف : حافظ صلاحُ الدین یوسف حفظہ اللہ

منتظمِ اعلیٰ : عبدُالمالک مجاھد

مجلسِ انتظامیہ : حافظ عبدالعظیم اسد (منیجر دارالسلام لاہور) محمد طارق شاھد

مجلسِ مشاورت : حافظ صلاح الدین یوسف ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر پروفیسر محمد یحیٰی مولانا محمد عبدالجبار

ڈیزائننگ اینڈ السٹریشن : زاھد سلیم چودھری (آرٹ ڈائریکٹر)

خطّاطی : اِکرام الحق

اشاعت اوّل: 2007

مضامین

چوتھا حق

پانچواں حق

تیسرا حق

چوتھا حق

پانچواں حق

چھٹا حق

ساتواں حق

آٹھواں حق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت رحم کرنے والا خوب مہربان ہے

عرض ناشر

آپ نے کبھی غور کیا کہ ہمارے معاشرے کا مزاج کیوں بگڑ گیا ہے؟ اس لیے کہ آج ہر شخص صرف اپنے نفع نقصان کا ترازو تھامے بیٹھا ہے اور حق و ناحق اور جائز و ناجائز کی تمیز اُٹھ گئی ہے۔ ہر فرد ہر متاع اور ہر نفع خود سمیٹ لینے کی فکر میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فرائض سے بیگانگی عام ہو گئی ہے، خود غرضی کا دور دورہ ہے اور ایک دوسرے کے حقوق بھلا دیے گئے ہیں۔ جب تک یہ صورتحال نہیں بدلتی اور تمام حقداروں کے حقوق بخیر و خوبی ادا کرنے کا احساس بیدار نہیں ہوتا، معاشرے کی حالت اعتدال پر نہیں آئے گی۔

دارالسلام نے یہ ضرورت بڑی دردمندی سے محسوس کی اور ادائے حقوق کا احساس اجاگر کرنے کے لیے حقوق سیریز کے عنوان سے مندرجہ ذیل پانچ کتابیں شائع کی ہیں:

① حقوق اللہ ② حقوق الوالدین ③ حقوق الزوجین (میاں بیوی کے حقوق)

④ حقوق الاولاد ⑤ حقوق العباد

حقوق و فرائض کے لحاظ سے یہ پانچوں موضوعات اس قدر اہم اور ہمہ گیر ہیں کہ ان سے آگاہ ہونے کی ضرورت سے کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ان آسان اور دلنشین کتابوں میں یہ حقیقت اجاگر کر دی گئی ہے کہ حقوق و فرائض کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، یعنی ایک شخص کا اپنا فرض ادا کرنا درحقیقت دوسرے فرد کا حق ادا کرنا ہے۔ جب تک ہم سب اپنی

اپنی جگہ اپنے اپنے فرائض نہیں پہچانیں گے اور دوسروں کے واجب الادا حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہوں گے، اس وقت تک ہم سچے اور کھرے مسلمان نہیں بن سکتے۔

حقوق و فرائض کا مسئلہ بڑا اہم اور تشریح طلب تھا جو متذکرہ بالا کتابوں میں پوری وضاحت سے بتا دیا گیا ہے اور یہ بنیادی حقیقت خوب روشن کر دی گئی ہے کہ رب کریم کے انسان پر کیسے کیسے احسانات اور انعامات ہیں اور ان کے پیش نظر انسان پر اللہ تعالیٰ کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ان حقوق کی ادائیگی کا ایک ہی معروف طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو فرائض عائد کیے ہیں وہ ادا کیے جائیں، یعنی بر وقت نماز پڑھی جائے، زکاۃ ادا کی جائے، رمضان المبارک کے روزے رکھے جائیں اور حج بیت اللہ کیا جائے۔ جب بندے یہ فرائض خوبی اور خلوص سے ادا کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انھوں نے ''حقوق اللہ'' ادا کر دیے۔

اسی طرح بندوں کے حقوق و فرائض کا معاملہ ہے۔ ان حقوق کی زبردست اہمیت ہے۔ ہم سب کسی نہ کسی حیثیت میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ بچوں کا حق ادا کریں۔ انھیں بہترین دینی تعلیم و تربیت سے آراستہ کریں اور مستقبل کی ذمہ داریوں سے روشناس کرائیں۔ ٹھیک اسی طرح اولاد کا فرض ہے کہ اپنے والدین کے حقوق ادا کرے، ان کا کہا مانے، ان کی دل و جان سے تعظیم کرے، ان کے سامنے بلند آہنگی سے نہ بولے اور ان کی ہر ممکن خدمت انجام دے۔

اسی طرح ہماری محترم خواتین کا فرض ہے کہ وہ اپنی عظمت و وقعت پہچانیں اور بحیثیت بیٹی، بہن، بیوی اور ماں اپنے اپنے مدارج میں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کریں۔ اسی طرح شوہر کا فرض ہے کہ بیوی کے ساتھ خلوص و محبت سے پیش آئے اور احسان و اکرام کا معاملہ کرے۔ وہ کوئی قصور یا غلطی کرے تو اسے بخش دے۔

عرضِ ناشر

یہی ایک فرد اور معاشرے کا معاملہ ہے۔ ہر صاحبِ استطاعت کا فرض ہے کہ معاشرے کے پسماندہ لوگوں کی مدد کرے، یتیموں، بیواؤں، غریبوں، رنجوروں اور بے نواؤں کی پوری فیاضی سے خدمت اور خبرگیری کرے۔

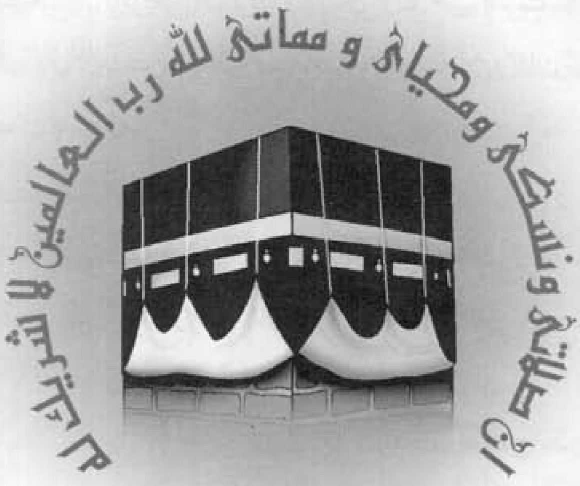
ادائے حقوق کی دینی تعلیمات کے یہ سارے گوہر والماس پہلے حقوق سیریز کی شکل میں پانچ الگ الگ کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ اب انھیں ''حقوق و فرائض'' کے عنوان سے یکجا کر کے نہایت خوبصورت پیرائے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب ہر مسلمان مرد اور عورت کی پہلی اور فوری ضرورت ہے۔ اِسے خود بھی پڑھیے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی مطالعے کی دعوت دیجیے۔ دارالسلام نیکی کا داعی اور حسنِ عمل کا طلب گار ہے۔ اگر آپ نے ''حقوق و فرائض'' کی تعلیمات پر عمل کر لیا تو یہ کتاب قیامت کے ہجوم و ہیجان میں آپ کے لیے وثیقۂ جنت بن جائے گی۔

اب جس کے دل میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ بام رکھ دیا

خادم کتاب وسنت
عبدالمالک مجاہد
مدیر: دارالسلام۔ الریاض، لاہور

شعبان 1427ھ / ستمبر 2006ء

حقوق اللہ



دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ دلوں کا چین چھن چکا ہے۔ ہماری زندگیوں میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اطمینان ہم سے کوسوں دور ہے۔ خودغرضی اور نفسانفسی نے ہر کسی کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ معاشرتی اقدار اور روایات زوال کا شکار ہو چکی ہیں۔ ظلم اور ناانصافی کا دور دورہ ہے۔ اخوت اور مساوات ناپید ہوتی جارہی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ایک دن یہ دنیا جہنم کا نمونہ بن جائے گی۔

معاشرتی ناہمواریاں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ افراد کو افراد سے شکایت کیوں ہوتی ہے؟ ہر طرف بے اطمینانی کی لہر کیوں دوڑنے لگتی ہے؟ جب ہم کسی کو اس کا حق نہیں دیتے تو پھر یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ایک سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے حقوق کا خیال نہیں رکھتے۔ وہ اللہ جس نے ہمیں تخلیق کیا اور وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کا فریضہ عائد کر کے اس دنیا میں بھیجا، اُس کے کسی بھی حق کو پورا نہیں کرتے۔

اللہ نے ہمیں توحید کا درس دیا، ہم نے توحید کے لبادے میں

بھی شرک کے پیوند لگا لیے۔ شرک، وہ واحد گناہِ عظیم ہے جس کی بخشش نہیں، اور ہم یہی گناہ کیے جا رہے ہیں۔ ہماری عبادات: نماز، روزہ، زکاۃ، حج محض نمود و نمائش کی چیزیں بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ کیسی عبادات ہیں جن کی ادائیگی کرنے کے بعد بھی ہماری زندگیاں اخلاص سے خالی ہیں۔ ہر معاملے میں جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے، فریب ہمارا کاروبار بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہماری زندگیوں سے امن و چین رخصت ہو چکا ہے۔ ہر طرف فتنہ و فساد ہے، ناچاقی اور جھگڑے ہیں۔

ہمارے انفرادی اور اجتماعی بگاڑ کا سبب یہی ہے کہ ہم حقوق اللہ سے روگردانی کر رہے ہیں۔ اللہ کے حقوق سے دوری ہی تباہی کے قریب لے جا رہی ہے۔ ہماری سلامتی کا واحد راستہ یہی ہے کہ ہم اس بات کو جانیں کہ ہم پر اللہ کے حقوق کیا ہیں اور اُن حقوق کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے؟ ان کو جاننے کے لیے آئندہ صفحات کا مطالعہ کیجیے:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی ضروریات کی تکمیل کا سروسامان بھی کیا۔ وہ اس طرح کہ ایک تو خود اسے بھی عقل و شعور سے نوازا اور دوسرے نمبر پر ساری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا۔ انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل و بصیرت سے کام لے کر کائنات میں اللہ کی پیدا کردہ چیزوں کو جوڑ جوڑ کر یا ان کو مختلف صورتوں میں ڈھال کر ایسی ایسی چیزیں بنا لیتا ہے جن سے انسان کو تمدنی سہولتیں اور جسمِ انسانی کو راحتیں حاصل ہوتی ہیں۔ گویا کچھ چیزیں تو ازخود ہی انسان کی خدمت میں مصروف ہیں اور وہ یہ خدمت صرف اللہ کے حکم سے سرانجام دیتی ہیں۔ انسان کی اپنی رسائی تو وہاں تک ہے ہی نہیں جیسے شمس و قمر کا نظام ہے۔ سورج اپنے وقت پر نکلتا ہے اور اپنے وقت پر غروب ہوتا ہے۔ اسی طرح چاند کا اور دیگر مُسَخَّر (انسانی خدمت پر مامور) اشیاء کا معاملہ ہے اور کچھ چیزوں کو انسان نے اپنے علم و ہنر اور محنت و کاوش سے اپنی خدمت کے قابل بنا لیا ہے۔ لوہے کی صنعت سے اس نے ریل، بس، کار، ہوائی جہاز وغیرہ بنائے، اے سی، پنکھے، ہیٹر، فریج اور اس طرح کی بے شمار چیزیں بنائیں۔ انسان کو یہ عقل و بصیرت اور شعور کس نے عطا کیا؟ یہ بھی اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔

اس اعتبار سے وہ چیزیں جو اللہ کے حکم سے انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں یا انسان نے اللہ کی پیدا کردہ چیزوں میں تصرف کر کے ان کو مختلف شکلوں میں ڈھال لیا ہے یا اللہ کی پیدا کردہ غذائی اجناس کو مرکبات کی شکل دے کر انواع و اقسام کے ذائقوں میں تبدیل کر

لیا ہے تو یہ سب اللہ ہی کی عطا کردہ نعمتیں اور اس کے احسانات ہیں۔ یہ نعمتیں اور احسانات اَن گنت ہیں یعنی اتنے ہیں کہ انھیں شمار نہیں کیا جا سکتا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط﴾

''اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گننا چاہو، تو تم ان کو گن نہیں سکتے۔''①

اِن اَن گنت نعمتوں اور بے پایاں احسانات کے بدلے میں اللہ تعالیٰ انسان سے کیا چاہتا ہے؟ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان صرف اسی ایک اللہ کی عبادت کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کا مقصدِ تخلیق یہی بیان کیا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○﴾

''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''②

ایک فارسی شعر میں اس بات کو اس طرح ادا کیا گیا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

یعنی بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان سب خدمت میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تجھے روٹی میسر آ جائے اور تُو غفلت کا ارتکاب نہ کرے۔ سب تیرے لیے سرگرم اور فرمانِ الٰہی کی بجاآوری میں مصروف ہیں، یہ انصاف کی بات نہیں ہوگی کہ تُو اللہ کی فرماں برداری کا مظاہرہ نہ کرے۔

انسان کو اللہ نے اپنی عبادت کا جو حکم دیا ہے، وہ اس لیے نہیں ہے کہ اس سے اللہ کی

① النحل 18:16 ② الذاریات 56:51

بادشاہت اور سلطنت میں یا اس کی قوت وشوکت میں اضافہ ہو جائے گا اور اگر انسان اللہ کی عبادت نہیں کرے گا تو اس کی سلطنت یا قوت وشوکت میں کوئی کمی آ جائے گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہے اور بلا شرکتِ غیرے تمام اختیارات اور قوتوں کا مالک ہے۔ انسان اللہ کی عبادت کرے گا تو اس میں اسی کا فائدہ ہے اور اگر وہ اللہ کی نافرمانی کا راستہ اختیار کرے گا، تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا، انسان خود ہی اپنی تباہی و بربادی کا سامان کرے گا۔ اس بات کو ایک حدیثِ قدسی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«يَاعِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، كَانُوا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا زَادَ ذٰلِكَ فِي مُلْكِي شَيْئًا، يَاعِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، كَانُوا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِي شَيْئًا، يَاعِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، قَامُوا فِي صَعِيدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُونِي، فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِي إِلاَّ كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ»

”اے میرے بندو! اگر تمھارے اوّل اور آخر اور (اسی طرح) تمام انسان اور جن اس ایک آدمی کی طرح ہو جائیں جو تم میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو (یعنی کوئی بھی نافرمان نہ رہے) تو اس سے میری حکومت اور بادشاہی میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اوّل و آخر، تمام انسان اور جن اس ایک آدمی کی طرح ہو جائیں جو تم میں سب سے بڑا نافرمان اور فاجر ہو تو اس سے میری حکومت اور

بادشاہی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اوّل و آخر، انسان اور جنّ سب ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھ سے سوال کریں، اور میں ہر انسان کو اس کے سوال کے مطابق عطا کر دوں تو اس سے میرے خزانے اور بادشاہی میں اتنی ہی کمی ہوگی جتنی سوئی کے سمندر میں ڈبو کر نکالنے سے سمندر کے پانی میں ہوتی ہے۔''[1]

مسند احمد میں حدیثِ قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«يَا ابْنَ آدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِي أَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى ، وَأَسُدَّ فَقْرَكَ ، وَإِلاَّ تَفْعَلْ مَلَأْتُ صَدْرَكَ شُغْلاً وَلَمْ أَسُدَّ فَقْرَكَ»

''اے ابنِ آدم! تُو میری عبادت کے لیے فارغ ہو جا، میں تیرا سینہ تونگری سے بھر دوں گا اور تیری حاجتیں پوری کر دوں گا، اگر تُو نے ایسا نہ کیا تو میں تیرے سینے کو اشغال سے بھر دوں گا، اور تیری حاجت مندی کا راستہ بند نہیں کروں گا۔''[2]

علامہ ابن کثیر نے تفسیر ابنِ کثیر میں سورۃ الذاریات آیت 56 کے تحت لکھا ہے:

''بعض آسمانی کتابوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابنِ آدم! میں نے تجھے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، لہٰذا تُو اس سے غفلت نہ کر۔ تیرے رزق کا میں ضامن ہوں، تُو اس میں بے جا تکلیف نہ کر۔ مجھے ڈھونڈ تا کہ تُو مجھے پالے، جب تُو نے مجھے پالیا تو یقین مان کہ تو نے سب کچھ پالیا اور اگر میں تجھے نہ ملا تو سمجھ لے کہ تمام بھلائیاں تو نے کھو دیں۔ سن! تمام چیزوں سے زیادہ محبت تیرے دل میں میری ہونی چاہیے۔''[3]

---

① صحيح مسلم ، البر والصلة ، باب تحريم الظلم ، حديث: 2577

② مسند أحمد: 358/2 و سلسلة الأحاديث الصحيحة ، حديث: 1359

③ تفسير ابن كثير عربي (دارالسلام): 304/4

اللہ تعالیٰ سورۃ الطلاق میں فرماتا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ۬ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا۠﴾

''اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمینیں بھی اتنی ہی۔ ان کے درمیان اللہ کا حکم نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے واضح ہوا کہ تخلیقِ کائنات اور اُس میں انتظامی احکام جاری کرنے سے مقصود اللہ تعالیٰ کی صفات کا اظہار اور اس کے کمالات کا تعارف کرانا ہے۔

بہرحال انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک، محسن و مُنعِم اور کائنات کے مدبر و منتظم کا حق پہچانے اور پھر اسے ادا کرنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ حق کون کون سے ہیں؟ اور انھیں کس طرح ادا کرنا ہے، اس کی مختصر تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] الطلاق 12:65

پہلا حق

توحیدِ الٰہی

توحید کا مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ ہر رسول اور نبی نے سب سے پہلے اپنی اپنی قوموں کو اسی توحید کی دعوت دی۔ ہر ایک نے یہی کہا:

﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾

''اے میری قوم! صرف اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔''①

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝﴾

''اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا، اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔''②

صحیح بخاری میں ہے، نبی کریم ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

«وَهَلْ تَدْرِي حَقَّ اللهِ عَلَى عِبَادِهِ؟ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ؟» قُلْتُ: اللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: «فَإِنَّ حَقَّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوهُ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَحَقَّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ أَنْ لَا

① الأعراف 59:7 ② الأنبياء 25:21

يُعَذِّبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا»

''کیا تمھیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟'' میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اسے عذاب نہ دے۔''[1]

اور یہ حق تمام حقوق سے پہلے ہے۔ نہ کوئی حق اس سے پہلے ہے، نہ اس سے بڑھ کر ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ﴾

''اور تمھارے پروردگار نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔''[2]

اور سورۃ الانعام میں بھی فرمایا:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ﴾

''کہہ دیجیے! آؤ میں تمھیں وہ پڑھ کر سناؤں جو تمھارے پروردگار نے تم پر واجب کیا ہے (وہ) یہ کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔''[3]

چونکہ یہ حق تمام حقوق سے افضل ہے، دین کے تمام احکام کی بنیاد ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ

[1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب اسم الفرس والحمار، حديث: 2856
[2] بني إسرائيل 23:17 [3] الأنعام 151:6

مکہ مکرمہ کی تیرہ سالہ زندگی میں لوگوں کو اسی حق کے قائم کرنے کی دعوت دیتے رہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کے شریک ہونے کی نفی کرتے رہے۔ قرآنِ کریم کی بیشتر آیات میں بھی اسی حق کو ثابت کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں شبہات کی نفی کی گئی ہے۔ ہر نمازی فرض نماز پڑھے یا نفل، یہ الفاظ کہہ کر اسی حق کو ادا کرنے کا عہد کرتا ہے:

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴾

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔''[1]

توحید کی یہ حقیقت اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی ہے۔

عبادت کا مطلب کیا ہے؟

عبادت کا مطلب ہے، کسی عظیم ہستی کو تمام اختیارات کا مالک سمجھ کر اس کے سامنے اپنی عاجزی، بے بسی اور لاچارگی کا اظہار کرنا۔

ایسی ہستی جس کی عظمت وقدرت کے سامنے انسان اپنے آپ کو بے بس محسوس کرے اور جو کچھ مانگنا ہو، اس کا عاجز بندہ بن کر صرف اسی سے مانگے۔ اسی کا خوف اپنے دل میں رکھے۔ اپنی اُمیدیں صرف اسی سے وابستہ کرے، نذر نیاز صرف اسی کے نام کی دے، وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور اس طرح سمجھنا اور کرنا یہ اللہ کی عبادت ہے۔ اسی طرح نماز ادا کرنا، روزہ رکھنا، بیت اللہ کا حج کرنا، زکاۃ دینا، یہ بھی عبادات ہیں جو صرف اللہ ہی کے لیے کی جاسکتی ہیں۔ نماز صرف اللہ کے لیے، روزہ صرف اللہ کے لیے، بیت اللہ کا حج اور اس کا طواف صرف اللہ کے لیے، زکاۃ و اِنفاق صرف اللہ کے لیے۔ ان میں سے کوئی بھی کام اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہیں کیا جاسکتا، اگر کیا جائے گا، تو یہ شرک ہے۔

---

[1] الفاتحة 5:1

ایک عام گمراہی

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عبادت صرف اللہ کے لیے نماز پڑھنا اور روزے رکھنا ہی ہے، چنانچہ وہ اللہ کے سوا کسی کے لیے نماز نہیں پڑھتے، کسی کے لیے روزے نہیں رکھتے، لیکن کسی اور کے نام پر نذر نیاز دینا، کسی اور سے ماورائے اسباب طریقے سے استغاثہ وفریاد کرنا یعنی دعا کرنا، اس کو وہ جائز سمجھتے ہیں۔ اور فوت شدہ لوگوں کے نام کی نذر نیاز بھی دیتے ہیں اور ان کو مدد کے لیے بھی پکارتے ہیں، حالانکہ نذر نیاز بھی عبادت ہے اور ماورائے اسباب طریقے سے کسی کو حاجت روا، مشکل کشا، دور اور نزدیک سے ہر ایک کی فریاد سننے والا باور کر کے اسے پکارنا اور اس سے دعا کرنا بھی عبادت ہے۔ ان آخری دو صورتوں میں غیر اللہ کی یہ عبادت عام ہے۔

شرک، انسانی فطرت کے خلاف ہے

صحیح مسلم میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلاَّ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ وَيُمَجِّسَانِهِ»

”ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر بچے کے والدین اسے یہودی، عیسائی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔“[1]

یہاں فطرت سے مراد وہی توحید ہے جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے، جو اسلام کا امتیاز ہے۔ دنیا میں پہلے صرف توحید ہی تھی، شرک بعد میں پیدا ہوا۔

---

[1] صحيح مسلم، القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة ..... ،حديث: 2658

اللہ تعالیٰ سورۃ البقرہ میں فرماتا ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾

''دراصل لوگ ایک ہی امت تھے، پس اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو خوش خبری سنائیں اور ڈرائیں، اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں تا کہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کریں جن میں انھوں نے اختلاف کیا۔''[1]

شرک کا آغاز اور اس کی بنیاد

سیدنا نوح علیہ السلام کی قوم نے سب سے پہلے شرک کیا، اور اس کا آغاز اس وقت ہوا جب انھوں نے نیک لوگوں کی تعظیم میں غلو کیا۔ انھوں نے اپنے بڑے بڑے پانچ بت بنا لیے تھے اور ان کی بابت وہ اتنے سخت تھے کہ اللہ نے ان کا قول نقل کیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۂ نوح میں فرماتا ہے:

﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝﴾

''اور انھوں نے کہا کہ ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑو ودّ کو، نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔''[2]

امام بخاری رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ''یہ نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگوں کے نام تھے۔ ان کے انتقال کرنے پر شیطان نے ان کی قوم کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ ان مجلسوں میں جہاں وہ بیٹھا کرتے تھے، (ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے)

---

① البقرة 213:2 ② نوح 23:71

مورتیاں بنا کر رکھو۔انھوں نے ایسا ہی کیا۔لیکن اس نسل کے لوگوں نے ان مورتیوں کی پوجا نہ کی۔ان کی پوجا اس وقت شروع ہوئی، جب مورتیاں رکھنے والے فوت ہو گئے اور لوگ ان کی اصل حقیقت کو بھول گئے۔''[1]

اسی طرح امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سلف میں کئی ایک نے کہا ہے کہ جب وہ نیک لوگ فوت ہو گئے تو انھوں نے ان کی قبروں پر ڈیرہ ڈال دیا۔ پھر انھوں نے ان کی مورتیاں بنا ڈالیں اور پھر کافی مدت گزرنے کے بعد ان کی پوجا شروع ہو گئی۔''

آپ غور کریں گے کہ شرک کس طرح شروع ہوا؟ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی بنیادی وجہ بزرگوں کی محبت میں غلو، یعنی انھیں ان کے مقام سے بڑھا دینا ہی ہوتا ہے۔عیسائیوں کو بھی اسی غلو نے گمراہ کیا، انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں اتنا مبالغہ کیا کہ انھیں اللہ یا ابن اللہ یعنی اللہ کا بیٹا بنا دیا۔ آج کل کے بہت سے مسلمان بھی اسی غلو اور عقیدت کا شکار ہو کر مشرکانہ عقائد و اعمال میں مبتلا ہیں۔ وہ بھی بہت سے فوت شدہ بزرگوں کو الٰہی صفات کا حامل ٹھہرا کر انھیں حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے پکارتے ہیں۔ان سے استغاثہ وفریاد کرتے ہیں اور ان سے ضرر کا اندیشہ اور نفع کی اُمید رکھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے سوا کسی اور کی بابت اس قسم کا عقیدہ رکھنا، شرک ہے، اور شرک اتنا بڑا جرم ہے کہ کبھی معاف نہیں ہوگا۔سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى إِثْمًا عَظِيْمًا ○﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ شرک کرنے والوں کو نہیں بخشے گا، اس کے علاوہ جسے چاہے گا، بخش دے گا۔اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مقرر کیا اس نے بہت بڑا گناہ اور

---

[1] صحیح البخاری، التفسیر، باب : ﴿وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ﴾، حدیث:4920

بہتان باندھا۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں، دوسرے مقام پر پھر یہی بات بیان فرمائی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ شرک کرنے والوں کو نہیں بخشے گا۔ اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والا بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''[2]

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾

''جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا ہے، تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ان مشرکوں کا (وہاں) کوئی مددگار نہیں ہوگا۔''[3]

اسی طرح اللہ تعالیٰ سورۃ الانعام میں فرماتا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾

''جو لوگ ایمان لا کر اپنے ایمان کو شرک سے خلط ملط نہیں کرتے، انھی لوگوں کے لیے امن ہے اور حقیقتاً راہ پانے والے لوگ وہی ہیں۔''[4]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اجْتَنِبُوا الْمُوْبِقَاتِ: الشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَالسِّحْرُ»

''شرک اور جادو سے بچو، یہ ہلاک کرنے والے ہیں۔''[5]

[1] النساء 48:4 [2] النساء 116:4 [3] المائدۃ 72:5 [4] الأنعام 82:6

[5] صحیح البخاری، الطب، باب الشرک والسحر من الموبقات، حدیث: 5764

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے معاذ! تم جانتے ہو، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق یہ ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں'' پھر فرمایا: ''تم جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟'' انھوں نے کہا، اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''یہ کہ انھیں عذاب نہ دے'' یعنی اگر وہ اللہ کی عبادت کریں گے، اور کسی کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے، تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ بھی انھیں عذاب نہیں دے گا۔[2]

سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَتَانِي جِبْرِيلُ فَبَشَّرَنِي أَنَّهُ مَنْ مَاتَ مِنْ أُمَّتِي لاَ يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ، قُلْتُ: وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ؟ قَالَ: وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ»

''میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور انھوں نے مجھے بشارت دی کہ میری امت میں سے جو شخص اس حال میں مر گیا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا ہوگا، تو اس کے لیے جنت ہے۔ میں نے کہا، اگرچہ اس نے چوری کی ہو، زنا کیا ہو۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: ہاں، اگرچہ اس نے چوری کی ہو اور زنا کیا ہو۔''[3]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَنَّ اللهَ تَعَالٰى يَقُولُ لِأَهْوَنِ أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا: لَوْ أَنَّ لَكَ مَا فِي

[2] صحیح البخاری، الجهاد والسير، باب اسم الفرس والحمار، حدیث: 2856

[3] صحیح البخاری، الاستئذان، باب من أجاب بلبيك وسعديك، حدیث: 6268، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على من مات لايشرك بالله شيئا دخل الجنة، وإن من ......، حدیث: 94

الأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ كُنْتَ تَفْتَدِي بِهِ؟ قَالَ : نَعَمْ، قَالَ فَقَدْ سَأَلْتُكَ مَا هُوَ أَهْوَنُ مِنْ هٰذَا وَأَنْتَ فِي صُلْبِ آدَمَ، أَنْ لاَ تُشْرِكَ بِي فَأَبَيْتَ إِلاَّ الشِّرْكَ»

''قیامت کے روز دوزخیوں میں سے سب سے کم عذاب والے سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اگر زمین کی کل چیزیں تیری ہوں، تو کیا ان سب کے بدلے میں اس عذاب سے نجات حاصل کرنا پسند کرے گا؟ وہ کہے گا، ہاں! (پسند کروں گا۔) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جب تو آدم کی پیٹھ میں تھا تو میں نے تجھ سے اس سے بھی کم چیز کا مطالبہ کیا تھا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا مگر تُو نے انکار کیا اور شرک ہی کیا۔''[1]

ان آیات اور احادیث سے ثابت ہوا کہ شرک سے بڑا گناہ کوئی نہیں اور یہ ناقابلِ معافی ہے۔ دوسرے گناہ معاف ہو سکتے ہیں، لیکن شرک معاف نہیں ہوگا۔

شرک کی اقسام اور مختلف شکلیں

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ہاں شرک کس کس شکل میں موجود ہے:

- اللہ کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا شرک ہے، لہٰذا جو لوگ قبروں کو سجدے کرتے ہیں یا تصاویر اور بتوں کو سجدے کرتے ہیں' وہ مشرک ہیں۔
- اللہ کے برابر کسی دوسرے کا علم ماننا، یہ بھی شرک ہے۔ بہت سے لوگ نبی اکرم ﷺ کا علم اللہ کے برابر مانتے ہیں، چنانچہ ایسے لوگ بھی مشرک ہیں۔
- اللہ تعالیٰ جیسی طاقت اور قدرت کسی اور ہستی میں ماننا، یہ بھی شرک ہے۔

[1] صحیح البخاری، أحادیث الأنبیاء، باب خلق آدم و ذریته، حدیث: 3334

❁ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مشکل کشا ماننا، یہ بھی شرک ہے۔

❁ ہماری دعائیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں سن سکتا، اگر ہم یہ خیال کر لیں کہ فلاں بزرگ بھی ہماری دعائیں سنتے ہیں، تو یہ بھی شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ سورۂ روم میں فرماتا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝﴾

''اللہ وہ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تمھیں روزی دی، پھر تمھیں موت دے گا۔ پھر تمھیں زندہ کرے گا۔ کیا تمھارے ٹھہرائے ہوئے معبودوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی کرتا ہو؟ پاک ہے وہ اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔''[1]

لا إله إلا الله کے صرف الفاظ کہہ دینے کافی نہیں، اس کے معانی بھی جاننے ضروری ہیں، اور وہ معانی صرف زبان سے اس بات کا اظہار کر دینا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، بلکہ ان الفاظ کی روح معلوم ہونی چاہیے۔ ہم پورے خلوص سے اس روح پر کاربند ہوں۔ وہ روح یہ ہے کہ آپ کے دل میں اس کے سوا کوئی اور نہ ہو، اللہ کے سوا کسی پر آپ کا بھروسا نہ ہو۔ صرف زبان سے توحید کا اظہار کچھ بھی مفید نہیں جب تک کہ دل لا إله إلا الله کا قائل نہ ہو۔ شاعرِ مشرق نے کیا خوب کہا ہے ؎

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(توحید اور شرک کی حقیقت سمجھنے اور مزید وضاحت کے لیے کتاب ''توحید اور شرک کی حقیقت'' مطبوعہ دارالسلام، ملاحظہ فرمائیں)

[1] الروم 40:30

دوسرا حق

نماز

اللہ کی توحید کا اقرار و اعتراف اور اس کے تقاضوں کی تکمیل اللہ کا پہلا حق ہے۔ عقیدۂ توحید کے بعد اللہ کے حقوق میں سب سے اہم حق نماز ہے۔ اس کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ نماز کا حکم پہلی اُمتوں کو بھی دیا جاتا رہا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں اس کی صراحت موجود ہے۔ قرآنِ کریم میں وضاحت کے ساتھ 109 مقامات پر نماز کا ذکر آیا ہے، مثلاً سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ○﴾

''اور نماز قائم کرو اور زکاۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''①

اسی طرح سورۃ البقرہ ہی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ ۙ○ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○ؑ﴾

''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو، اور یہ بہت بھاری ہے مگر ڈر رکھنے والوں پر (بھاری نہیں)۔ جو جانتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''②

اسی طرح سورۃ البقرہ کے اور کئی مقامات پر بھی نماز کا ذکر ہے۔ سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ

① البقرة 43:2 ② البقرة 46,45:2

فرماتا ہے:

﴿وَ اَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۭ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝﴾

''اور یہ کہ تم نماز کی پابندی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور وہی ذات ہے جس کی طرف تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے۔''①

سورۂ آلِ عمران، سورۂ نساء، سورۂ مائدہ، سورۂ اعراف، سورۂ انفال سورۂ توبہ، سورۂ یونس، سورۂ ہود، سورۂ رعد، سورۂ ابراہیم، سورۂ حجر، سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ مریم، سورۂ طٰہٰ، سورۂ انبیاء، سورۂ حج، سورۂ مومنون، سورۂ نور، سورۂ فرقان، سورۂ شعراء، سورۂ نمل، سورۂ عنکبوت، سورۂ روم، سورۂ سجدہ، سورۂ احزاب، سورۂ فاطر، سورۂ زمر، سورۂ شوریٰ، سورۂ فتح، سورۂ ق، سورۂ ذٰریٰت، سورۂ طور، سورۂ نجم، سورۂ مجادلہ، سورۂ جمعہ، سورۂ قلم، سورۂ معارج، سورۂ جنّ، سورۂ مزمل، سورۂ مدثر، سورۂ قیامہ، سورۂ دھر، سورۂ مرسلٰت، سورۂ اعلیٰ، سورۂ علق، سورۂ بینہ، سورۂ ماعون اور سورۂ کوثر میں نماز کا ذکر موجود ہے۔

اِس تفصیل سے آپ نماز کی اہمیت جان سکتے ہیں۔

اب اس کی بابت چند احادیث بھی ملاحظہ فرمالیں، ان سے بھی نماز کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا:

«الصَّلَاةُ عَلَى وَقْتِهَا» قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: «بِرُّ الْوَالِدَيْنِ» قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: «الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ»

① الأنعام 6:72

”نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا۔“ عرض کیا: پھر کون سا عمل؟ فرمایا: ”ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔“ عرض کیا: پھر کون سا عمل؟ فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا۔“[1]

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اسْتَقِيمُوا وَلَنْ تُحْصُوا، وَاعْلَمُوا أَنَّ مِنْ أَفْضَلِ أَعْمَالِكُمُ الصَّلاَةَ، وَلاَ يُحَافِظُ عَلَى الْوُضُوءِ إِلاَّ مُؤْمِنٌ»

”اے لوگو! سیدھی روش رکھو، حق پر قائم رہو اور تم ہرگز ایسا نہ کرسکو گے کہ پوری پوری سیدھی روش رکھو، یعنی (کچھ نہ کچھ کمی و کوتاہی تم سے ضرور ہو جائے گی) اور یہ جان لو کہ تمہارے اچھے کاموں میں نماز سب سے بہتر ہے، اور مومن کے علاوہ کوئی وضو کی حفاظت نہیں کرتا۔“[2]

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«رَأْسُ الأَمْرِ الْإِسْلاَمُ، وَعَمُودُهُ الصَّلاَةُ، وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ»

”معاملے کی بنیاد اسلام ہے، اور اس کا ستون نماز ہے، اور اس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے۔“[3]

سنن ابن ماجہ کی اس حدیث سے نماز کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے محبوب دوست یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی کہ:

---

① صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب فضل الصلاة لوقتها، حديث: 527

② سنن ابن ماجه، الطهارة و سننها، باب المحافظة على الوضوء، حديث: 278

③ جامع الترمذي، الإيمان، باب ماجاء في حرمة الصلاة، حديث: 2616

«لَا تُشْرِكْ بِاللهِ شَيْئًا وَإِنْ قُطِّعْتَ وَحُرِّقْتَ ، وَلاَ تَتْرُكْ صَلاَةً مَكْتُوبَةً مُتَعَمِّدًا ، فَمَنْ تَرَكَهَا مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ ، وَلاَ تَشْرَبِ الْخَمْرَ ، فَإِنَّهَا مِفْتَاحُ كُلِّ شَرٍّ»

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنانا، چاہے تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے، یا تجھے آگ میں جلا دیا جائے اور فرض نماز کو بھی قصداً نہ چھوڑنا، کیونکہ جس نے قصداً فرض نماز کو چھوڑ دیا، تو اس سے (اللہ تعالیٰ کا) ذمہ اٹھ گیا، اور شراب بھی نہ پینا، کیونکہ یہ ہر برائی کا دروازہ کھولنے والی چیز ہے۔''[1]

نماز کی اس قدر تاکید کے ساتھ ساتھ نماز چھوڑنے والے کے بارے میں بھی سخت وعید آئی ہے۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلاَةُ ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»

''ہمارے اور کافروں کے درمیان عہد (کی بنیاد) نماز ہے، لہٰذا جس نے نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔''[2]

سنن ابی داود میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلاَةِ»

''بندے اور کفر میں فرق (کرنے والی چیز صرف) نماز کا چھوڑنا ہے۔''[3]

جامع ترمذی میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی اس طرح ہے:

«بَيْنَ الْكُفْرِ وَالإِيمَانِ تَرْكُ الصَّلاَةِ»

---

① سنن ابن ماجه ، الفتن ، باب الصبر على البلاء ، حديث :4034

② جامع الترمذی ، الإيمان ، باب ماجاء فی ترك الصلاة ، حديث :2621

③ سنن أبی داود ، السنة ، باب فی ردالإرجاء ، حديث :4678

''ایمان اور کفر کے درمیان نماز چھوڑنے کا فرق ہے۔''[1]

یعنی جس نے نماز چھوڑ دی، اس نے ایمان اور کفر کے درمیان فرق کو ختم کر دیا۔

نماز کی قبولیت کے لیے بنیادی شرطیں

قبولیتِ نماز کے لیے ضروری ہے کہ طہارت کے علاوہ

- اس کے جسم پر جو لباس ہو، وہ حلال کمائی سے بنایا ہوا ہو۔
- خشوع وخضوع سے نماز پڑھی جائے۔
- سنت کے مطابق اعتدالِ ارکان کا اہتمام کیا جائے، یعنی نماز کے ہر رکن کو اطمینان کے ساتھ ادا کیا جائے۔

(نماز کے اہم ضروری مسائل کے لیے کتاب ''مسنون نماز'' اور ''محمدی نماز'' مطبوعہ دارالسلام ملاحظہ فرمائیں)

---

[1] جامع الترمذی، الإیمان، باب ماجاء فی ترك الصلاۃ، حدیث: 2618

تیسرا حق

زکاۃ

نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کا اہم حق زکاۃ کی ادائیگی ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنِ حکیم میں تیس سے زیادہ مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ط﴾

''اور نماز قائم کرو اور زکاۃ ادا کرو۔''

قرآنِ کریم میں ستّر سے زیادہ مقامات پر انفاق فی سبیل اللہ کا حکم آیا ہے، یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا۔جس میں نفلی صدقات کے ساتھ ساتھ فرضی صدقہ زکاۃ بھی آجاتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے زکاۃ سب مسلمانوں پر فرض نہیں کی ،صرف صاحبِ نصاب شخص پر فرض کی ہے اور زکاۃ فقرا، مساکین، محرومین وغیرہ کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے کمال شفقت اور رحمت سے اپنے ضرورت مند بندوں کی فلاح و بہبود کو اپنا حق قرار دے دیا۔ یہ اس کی کس قدر مہربانی ہے......حق اس کا اور فائدہ اٹھائیں بندے۔سبحان اللہ!

زکاۃ کی ادائیگی بھی فرض ہے۔نماز اور روزہ تو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب،اس کے گھر میں کھانے کو ہو یا نہ ہو، وہ جھونپڑی میں رہتا ہو یا کوٹھی میں، اسے نماز بھی پڑھنی ہوگی اور روزے بھی رکھنے پڑیں گے، جب کہ زکاۃ صرف صاحبِ نصاب ادا کرے گا، یعنی جو لوگ بافراغت کھانے پینے والے ہوں، اور جن کے پاس روزمرہ ضروریات میں سے خرچ کرنے کے بعد کچھ بچ بھی جائے۔

نماز، روزے اور زکاۃ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ نماز اور روزہ صرف اللہ کا حق ہیں، جب کہ زکاۃ میں اللہ کے حق کے ساتھ بندے بھی شامل ہیں۔

ایک فرق یہ بھی ہے کہ نماز اور روزہ جسمانی عبادات ہیں، جب کہ زکاۃ مالی عبادت ہے۔

سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط﴾

''آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے، جس کے ذریعے سے آپ ان کو پاک صاف کریں اور ان کے لیے دعا کیجیے۔''[1]

یہ حکم عام ہے۔ صدقے سے مراد فرضی صدقہ یعنی زکاۃ بھی ہو سکتی ہے، اور نفلی صدقہ بھی۔ یعنی نبی کریم ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ صدقے کے ذریعے سے مسلمانوں کی تطہیر اور ان کا تزکیہ فرما دیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زکاۃ و صدقات انسان کے اخلاق و کردار کی طہارت و پاکیزگی کا بڑا ذریعہ ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:

«مَا يَسُرُّنِي أَنَّ عِنْدِي مِثْلَ أُحُدٍ هٰذَا ذَهَبًا تَمْضِي عَلَيَّ ثَالِثَةٌ وَعِنْدِي مِنْهُ دِينَارٌ إِلاَّ شَيْئًا أَرْصُدُهُ لِدَيْنٍ»

''مجھے اس سے بالکل خوشی نہیں ہوگی کہ میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور اس پر تین دن اس طرح گزر جائیں کہ اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی رہ جائے سوائے اس تھوڑی سی رقم کے جو میں قرض کی ادائیگی کے لیے رکھ چھوڑوں۔''[2]

---

[1] التوبۃ 103:9

[2] صحیح البخاری، الرقاق، باب قول النبی ﷺ مایسرنی أن عندی مثل أحد هذا ذهبا، حدیث:6444

آپ نے ایک مرتبہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«أَنْفِقْ بِلاَلُ! وَلاَ تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلاَلاً»

''اے بلال! خرچ کرو، عرش کے مالک سے کمی کا اندیشہ نہ کرو۔''①

یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے کمی نہیں آتی، بلکہ تم جس کی راہ میں خرچ کر رہے ہو، وہ زمین اور آسمان کا مالک ہے۔ جن لوگوں پر زکاۃ فرض ہے اور وہ ادا نہیں کرتے، ان کے بارے میں صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ وَلاَ فِضَّةٍ، لاَ يُؤَدِّي مِنْهَا حَقَّهَا، إِلاَّ إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، صُفِّحَتْ لَهُ صَفَائِحُ مِنْ نَارٍ، فَأُحْمِيَ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ، فَيُكْوَى بِهَا جَنْبُهُ وَجَبِينُهُ وَظَهْرُهُ كُلَّمَا رُدَّتْ أُعِيدَتْ لَهُ»

''جس کے پاس سونا اور چاندی ہو اور وہ اس کی زکاۃ ادا نہ کرے، تو قیامت کے دن اس کے لیے آگ کی تختیاں بنائی جائیں گی، اور دوزخ کی آگ میں ان کو گرم کر کے پھر اس کے دونوں پہلوؤں، پیٹھ اور پیشانی کو داغا جائے گا، اور جب یہ ٹھنڈی ہو جائیں گی، تو پھر ان کو گرم کر کے ان سے اس کو داغا جائے گا۔''②

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ آتَاهُ اللهُ مَالاً فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مُثِّلَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا أَقْرَعَ لَهُ زَبِيبَتَانِ، يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ثُمَّ يَأْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ، يَعْنِي بِشِدْقَيْهِ، ثُمَّ يَقُولُ: أَنَا مَالُكَ، أَنَا كَنْزُكَ»

① شعب الإيمان للبيهقي، حديث: 1345

② صحيح مسلم، الزكاة، باب إثم مانع الزكاة، حديث: 987

''جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے اور وہ اس کی زکاۃ نہیں دیتا تو قیامت کے دن اس کے مال کو ایک بہت ہی زہریلے اور گنجے سانپ، جس کی آنکھوں کے پاس دو سیاہ نقطے ہوں گے، کی شکل میں ڈھال دیا جائے گا اور اسے اس کی گردن کا طوق (ہار) بنا دیا جائے گا، وہ اس کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا: میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔''①

ایک مرتبہ دو عورتیں آپ کی خدمت میں آئیں، ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا:

«أَتُؤَدِّيَانِ زَكَاتَهُ؟» قَالَتَا : لاَ ، قَالَ : فَقَالَ لَهُمَا رَسُولُ اللهِ ﷺ : «أَتُحِبَّانِ أَنْ يُسَوِّرَكُمَا اللهُ بِسِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ؟» قَالَتَا : لاَ ، قَالَ : «فَأَدِّيَا زَكَاتَهُ»

''کیا تم ان کی زکاۃ دیتی ہو؟'' انھوں نے کہا: جی نہیں، آپ نے فرمایا: ''کیا تم کو یہ پسند ہے کہ ان کے بدلے اللہ تعالیٰ تمھیں آگ کے دو کنگن پہنائے؟'' وہ بولیں، نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب پھر ان کی زکاۃ دیا کرو۔''②

عورتوں کو زیورات سے بہت محبت ہوتی ہے، انھیں اس حدیث پر غور کرنا چاہیے۔ جو لوگ مال رکھتے ہوئے زکاۃ نہیں دیتے، وہ اپنے لیے قیامت میں کتنا بڑا عذاب تیار کر رہے ہیں۔ دنیا میں آدمی اسی مال کی وجہ سے آرام اور چین کی زندگی بسر کرتا ہے، بیماری اور دکھ تکلیف سے نجات حاصل کرتا ہے، لیکن اگر اس نے زکاۃ ادا نہ کی، تو یہی مال قیامت کے دن اس کے لیے عیش و عشرت کی بجائے آگ کا سبب بن جائے گا۔

① صحيح البخاري ، الزكاة ، باب إثم مانع الزكاة ، حديث :1403

② جامع الترمذي ، الزكاة ، باب ماجاء في زكاة الحلي ، حديث :637

زکاۃ کی ادائیگی دین میں کس قدر اہم ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عمل کا جائزہ لیجیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب آپ خلیفہ ہوئے، تو کئی فتنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ اسلام سے پھر گئے، انھوں نے مسیلمہ کذاب کو نبی مان لیا، کچھ قبائل نے زکاۃ دینے سے انکار کر دیا، اور اعلان کیا کہ ہم دین کے باقی ارکان پر تو عمل کریں گے، لیکن زکاۃ نہیں دیں گے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اُن کے خلاف جہاد کا اعلان فرما دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا پتا چلا تو آپ کی خدمت میں آئے اور کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کلمہ گو مسلمانوں کے خلاف جنگ نہیں ہو سکتی، اسلام لانے کے بعد ان کی جان اور ان کے مال محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! یہ ٹھیک ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ جب کوئی کلمہ گو کلمے کا حق ادا نہ کرے تو اس سے جنگ کی جائے، اور جس طرح نماز اللہ کا ایک حق ہے، اسی طرح زکاۃ بھی اللہ کا ایک حق ہے، یہ لوگ اس سے انکار کر رہے ہیں اور دونوں حقوں کے درمیان فرق کر رہے ہیں، یعنی ایک کو ضروری اور دوسرے کو غیر ضروری قرار دے رہے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ جواب سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے پر نظر ثانی کی اور اس پر دوبارہ غور کیا، تو اللہ نے اُن کا سینہ بھی اسی طرح کھول دیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھولا تھا اور وہ اس بات کے قائل ہو گئے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف صحیح ہے اور تمام صحابہ نے بھی خلیفۂ وقت کی اس رائے سے اتفاق کیا، یوں منکرینِ زکاۃ کے کفر پر صحابۂ کرام کا اجماع ہو گیا۔

معلوم ہوا کہ زکاۃ ایسا حق ہے کہ جو ادا نہ کرے، اُس کے خلاف جہاد کیا جائے گا، اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کیا۔

زکاۃ جہاں اللہ کا حق ہے، وہاں بندوں کا بھی حق ہے۔ فرض عبادات میں نماز، روزہ اور حج خالص اللہ کے حقوق ہیں، لیکن زکاۃ کی حیثیت دُہری ہے۔ یہ اللہ کا حق ہونے کے ساتھ

ساتھ بندوں کا حق بھی ہے۔اسی طرح اگر کوئی شخص زکاۃ نہیں دیتا تو وہ اللہ کے حق میں کوتاہی کے ساتھ بہت سے بندوں کا حق بھی مارتا ہے۔

زکاۃ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دولت زیادہ سے زیادہ گردش میں رہے۔ چند لوگوں کے پاس جمع ہوکر نہ رہ جائے، کیونکہ معاشی خوش حالی کا بنیادی فلسفہ یہی ہے کہ ساری دولت چند لوگوں کی مٹھی میں نہ رہے، بلکہ پھیلتی رہے۔ آخرت کے فائدے کے علاوہ زکاۃ کے بے شمار دنیاوی فوائد بھی ہیں:

- اس سے غریبوں کی مدد ہوتی ہے۔
- بھائی چارے اور ہمدردی کی فضا قائم ہوتی ہے۔
- محبت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔
- مال کی محبت کم ہوتی ہے۔ جب آدمی میں مال کی محبت کم ہوتی ہے، تو اس میں اخلاق، شرافت اور عاجزی پیدا ہوتی ہے۔

غور کیا جائے تو اس سے دنیا کے غریبوں اور کم آمدنی رکھنے والے لوگوں کو کتنا فائدہ ہوتا ہے۔اس کی مثال یوں ہے کہ ہمارے ملک کی پوری آمدنی پر زکاۃ نکالی جائے تو یہ زکاۃ اربوں میں ہوگی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف پاکستان کے اندر زکاۃ کی مَد میں نکلنے والی سالانہ رقم 70 سے 80 ارب کے درمیان ہے۔ ان اربوں روپے سے ملک کے کتنے غریبوں اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کیا جاسکتا ہے، اور ضرورت کے وقت انھیں قرض دیا جاسکتا ہے، اور اس رقم پر نہ ان سے سود لیا جائے گا اور ادا نہ کرنے کی صورت میں ان کی جائیداد ضبط نہیں کی جائے گی۔

عربی زبان میں زکاۃ کے معنی پاک ہونے اور بڑھنے کے ہیں۔ جب کہ شریعت میں خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے شرعی حکم کے مطابق ایک مقررہ مال کسی مستحق مسلمان کو دینے کا

نام زکاۃ ہے۔یعنی وہ اس رقم کا مالک ہوجاتا ہے،لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ زکاۃ دینے والا زکاۃ لینے والے سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے۔اگر وہ کسی طرح کا فائدہ اٹھائے گا، یا فائدے کی امید رکھے گا،تو خطرہ ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی زکاۃ قبول نہ ہو۔شریعت میں اس کو زکاۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس طرح دینے والے کا مال پاک ہوجاتا ہے۔اس کی نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے، وہ آخرت کے عذاب سے بچ جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے بہت سے غریبوں کے پاس مال آجاتا ہے۔ وہ اس سے اپنا کام چلاتے ہیں۔کوئی کام کاج کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔

زکاۃ ہر صاحبِ نصاب شخص پر فرض ہے جو مسلمان ہو اور آزاد ہو۔اس میں بالغ اور عاقل ہونا شرط نہیں۔چھوٹے بچے اور مجنون کے مال پر بھی زکاۃ واجب ہوتی ہے۔زکاۃ اس مال پر واجب ہے، جس پر پورا ایک سال گزر جائے۔کل مال پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکاۃ نکالی جاتی ہے۔

زکاۃ کے مسائل کے لیے کتاب زکاۃ وعشر کے احکام مطبوعہ دارالسلام ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں حقوق اللہ کے ضمن میں اس کا مختصر بیان ہو رہا ہے۔صرف اتنا جان لیں کہ کس کس مال پر زکاۃ ہے۔ زکاۃ سونے ، چاندی، مالِ تجارت اور نقد رقم پر واجب ہے۔ اسی طرح جو مویشی حدِ نصاب کو پہنچتے ہوں، ان پر بھی زکاۃ ہے۔ ان کے علاوہ زمین کی پیداوار پر بھی زکاۃ ہے۔ اس کا نصاب جدا ہے۔ اس کو عُشر کہتے ہیں۔

(ان سب کے تفصیلی احکام اور زکاۃ کے دیگر مسائل وفوائد کے لئے مذکورہ کتاب ''زکاۃ وعشر کے احکام'' دیکھیں)

چوتھا حق

روزہ

توحید، نماز اور زکاۃ کے بعد اب ہم آتے ہیں روزے کی طرف۔ اللہ تعالیٰ سورۃ البقرہ میں فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾

''اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے دوسری امتوں پر فرض کیا گیا تھا، تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔''[1]

اس کا مطلب ہے کہ روزہ پہلی امتوں پر بھی فرض تھا۔ اسلامی شریعت میں مسلمانوں پر سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض کیے گیے ہیں۔ روزے کا مطلب یہ ہے کہ دن بھر (صبح صادق سے غروب شمس تک) آدمی کھانے، پینے، بے ہودہ گوئی فضولیات اور عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے پرہیز کرے۔ روزے کی فضیلت میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قَالَ اللهُ : كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَهُ إِلاَّ الصِّيَامَ فَإِنَّهُ لِي، وَأَنَا أَجْزِي بِهِ»

---

[1] البقرة 2:183

’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آدمی کے سب اعمال اس کے لیے ہیں لیکن روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا۔‘‘[1]

یعنی روزہ ایک ایسی عبادت ہے کہ اس کا بدلہ عام نیکیوں کی جزا سے ہٹ کر میں خود ہی دوں گا اور قیامت کے روز ہی بتلاؤں گا۔

سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: مجھے کسی (بڑے) عمل کا حکم دیجیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«عَلَيْكَ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لاَ عِدْلَ لَهُ» قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! مُرْنِي بِعَمَلٍ، قَالَ: «عَلَيْكَ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لاَ عِدْلَ لَهُ»

’’روزے رکھو، کیونکہ کوئی عمل اس جیسا نہیں۔‘‘ میں نے دوبارہ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کسی (بڑے) عمل کا حکم دیجیے، آپ نے فرمایا: ’’روزے رکھو، کیونکہ کوئی عمل اس جیسا نہیں۔‘‘[2]

مطلب یہ ہے کہ بعض خصوصیات کی بنا پر روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کی کوئی مثال نہیں، کیونکہ انسان جب روزہ رکھتا ہے تو اللہ کی محبت اور اس کے خوف کی بنیاد پر گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«الصَّوْمُ جُنَّةٌ مِنْ عَذَابِ اللهِ كَجُنَّةِ أَحَدِكُمْ مِنَ الْقِتَالِ»

’’روزہ تمھیں عذاب الٰہی سے اسی طرح بچاتا ہے جس طرح ڈھال تمھیں لڑائی سے بچاتی ہے۔‘‘[3]

---

① صحيح البخاري، الصوم، باب هل يقول: إني صائم إذا شتم، حديث: 1904

② سنن نسائي، الصيام، باب ذكر الاختلاف على محمد بن أبي يعقوب في حديث أبي أمامة في فضل الصائم، حديث: 2225

③ مسند أحمد: 217/4

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ يَفْرَحُهُمَا : إِذَا أَفْطَرَ فَرِحَ ، وَإِذَا لَقِيَ رَبَّهُ فَرِحَ بِصَوْمِهِ»

''روزے دار کو دو خوشیاں نصیب ہوتی ہیں، ایک تو اس وقت جب وہ روزہ افطار کرتا ہے، اور اپنے افطار پر خوش ہوتا ہے۔ دوسری خوشی اسے اس وقت ملے گی جب وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرے گا۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ ، يَقُولُ الصِّيَامُ : رَبِّ إِنِّي مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّرَابَ بِالنَّهَارِ ، فَشَفِّعْنِي فِيهِ ، وَيَقُولُ الْقُرْآنُ : رَبِّ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِي فِيهِ ، فَيُشَفَّعَانِ»

''روزہ اور قرآن دونوں بندے کی شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اسے دن میں کھانے اور پینے سے روکے رکھا، اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما، اور قرآن کہے گا: اے میرے رب! میں نے اسے رات کو سونے سے روکے رکھا (یعنی اس نے تراویح میں قرآن سنا) لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں) ان دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔''[2]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ ! لَخُلُوفُ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللهِ

---

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب هل يقول : إني صائم إذا شتم، حديث :1904

[2] مسند أحمد :2/174، وصحيح الترغيب والترهيب للألباني، حديث :1429

مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ»

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! روزے دار کے منہ کی بو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ ہے۔''①

(یہ بو معدے کے خالی ہونے سے پیدا ہوتی ہے)

رمضان المبارک میں روزے جیسی عظیم الشان عبادت کے ساتھ ایک اور عبادت یعنی تراویح کا تحفہ ملا۔ تراویح اور تہجد دراصل دونوں ایک ہی عبادت ہیں۔ رمضان میں عشاء کے بعد جو نفلی نماز ادا کی جاتی ہے، اسے تراویح کہتے ہیں اور غیر رمضان میں جو نماز صبح صادق سے پہلے پڑھی جاتی ہے، اس کو تہجد کہتے ہیں۔

احادیث میں قیام رمضان یعنی تراویح کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»

''جس شخص نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے رمضان میں قیام کیا اس کے گزشتہ سارے (صغیرہ) گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''②

نبی کریم ﷺ عام حالات میں جس طرح قیام اللیل کا اہتمام فرماتے تھے رمضان میں بھی اسی طرح قیام اللیل یعنی تراویح کا اہتمام کرتے تھے۔ رمضان کی آخری دس راتوں کے قیام کا آپ خصوصی اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ ان راتوں میں جہاں آپ خود قیام کرتے وہاں اپنے ساتھ گھر والوں کو بھی بیدار کرتے۔ صحیح مسلم میں ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں:

---

① صحيح البخاري، الصوم، باب هل يقول: إني صائم إذا شتم، حديث: 1904

② صحيح البخاري، الإيمان، باب تطوع قيام رمضان من الإيمان ، حديث: 37

"رسول اللہ ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ جب رمضان کا آخری عشرہ داخل ہوتا تو آپ رات کو جاگتے، (ساتھ میں) گھر والوں کو بھی جگاتے، اور عبادت میں نہایت کوشش کرتے، اور کمرِ ہمت باندھ لیتے۔" ①

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ایک دوسری روایت میں ہے:

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الأَوَاخِرِ مَا لاَ يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهِ

"رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں عبادت میں جتنی کوشش کرتے تھے، دیگر دنوں میں اتنی کوشش نہیں کرتے تھے۔" ②

ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ رمضان میں قیام اللیل یعنی تراویح کا اہتمام کرے اور رمضان کے آخری عشرے میں بالخصوص عبادت میں دلچسپی لے۔ خود بھی نوافل و اذکار کا اہتمام کرے اور گھر والوں کو بھی اس کی ترغیب دے اور اپنے ساتھ انھیں بھی بیدار کرے۔

اسی طرح رمضان المبارک میں اعتکاف کی عبادت عطا کی گئی۔ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے عبادت کی غرض سے، جامع مسجد کے کسی گوشے میں ٹھہرنا، اعتکاف کہلاتا ہے۔ اعتکاف کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ ہر وقت اللہ کا ذکر ہو، اور اس کی رضا و قرب کی تلاش ہو، مخلوق کی بجائے اللہ تعالیٰ سے انس ہو۔ نبیِ کریم ﷺ کی عام عادتِ مبارکہ یہی تھی کہ آپ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرتے تھے، جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَعْتَكِفُ فِي كُلِّ رَمَضَانَ عَشْرَةَ أَيَّامٍ، فَلَمَّا كَانَ

---

① صحيح مسلم، الاعتكاف، باب الاجتهاد فى العشر الأواخر......، حديث: 1174

② صحيح مسلم، الاعتكاف، باب الاجتهاد فى العشر الأواخر......، حديث: 1175

الْعَامُ الَّذِي قُبِضَ فِيهِ اعْتَكَفَ عِشْرِينَ يَوْمًا

''نبی کریم ﷺ اپنی وفات تک مسلسل رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرتے رہے۔ (یعنی آپ کا عام معمول یہی تھا) لیکن جس سال آپ نے وفات پائی اس سال آپ نے بیس روز اعتکاف فرمایا۔''[1]

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رمضان کے درمیانی عشرے میں بھی اعتکاف کیا جا سکتا ہے، البتہ آخری عشرے میں اعتکاف کرنا افضل ہے، اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیس دن کا اعتکاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ہم یہ بات بھی ذکر کر دیں کہ اعتکاف کے لیے رمضان المبارک یا روزے کا ہونا ضروری نہیں۔ غیر رمضان اور بغیر روزے کے بھی اعتکاف ہو سکتا ہے۔ اسی طرح دس دن سے کم کا بھی اعتکاف ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن یا ایک رات کا بھی اعتکاف ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے زمانۂ جاہلیت میں، مسجد حرام میں ایک رات اعتکاف کی نذر مانی تھی۔ انھوں نے اس بات کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا:

''أَوْفِ نَذْرَكَ (عمر!) اپنی نذر پوری کرو۔'' چنانچہ انھوں نے ایک رات کا اعتکاف کیا۔[2]

دورانِ اعتکاف میں کثرت سے نفلی نماز، قرآنِ مجید کی تلاوت، ذکرِ الٰہی، تسبیح و تہلیل تحمید و تکبیر اور درود شریف وغیرہ پڑھنے میں مشغول رہنا چاہیے۔ اعتکاف کی حالت میں دنیا کی فضول باتوں سے اور دنیاوی امور و معاملات میں صلاح و مشورہ سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

---

[1] صحیح البخاری، الاعتکاف، الاعتکاف فی العشر الأوسط من رمضان، حدیث: 2044

[2] صحیح البخاری، الاعتکاف، باب من لم یر علیه إذا اعتکف صوما، حدیث: 2042

حالتِ اعتکاف میں تیمارداری کے لیے جانا، جنازے میں شریک ہونا، بیوی سے قربت اختیار کرنا منع ہے۔ البتہ بیوی سے ملاقات کر سکتا ہے، اور ساتھ کوئی محرم نہ ہو تو اُسے گھر تک بھی چھوڑ سکتا ہے۔

عورتیں اگر اعتکاف کرنا چاہیں تو شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے ایسی مسجد میں اعتکاف کر سکتی ہیں، جہاں عورتوں کے لیے مردوں سے الگ ہر چیز کا انتظام ہو اور ان کی حفاظت کا بھی معقول بندوبست ہو۔ عورتوں کا اپنے گھروں میں اعتکاف کرنا قرآن و سنت سے ثابت نہیں۔

پھر اس مبارک مہینے میں ایک انعام شبِ قدر کا رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ القدر میں فرماتا ہے کہ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»

''جس شخص نے شبِ قدر میں ایمان کی حالت میں، اور ثواب کیلیے قیام کیا، اس کے سابقہ (صغیرہ) گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔''[1]

(رمضان المبارک کے فضائل اور احکام و مسائل کی مزید تفصیل کے لیے کتاب ''احکام و مسائلِ رمضان'' طبع دارالسلام کا مطالعہ فرمائیں)

---

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب من صام رمضان إيمانا واحتسابا ونية، حديث: 1901

پانچواں حق

حج بیت اللہ

رمضان کے روزوں کے بعد اللہ تعالیٰ کا پانچواں حق حج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج صرف صاحبِ استطاعت لوگوں پر فرض کیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ط﴾

''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر، جو اس کی طرف راستے کی استطاعت رکھتے ہوں، اس گھر کا حج فرض کیا ہے۔''[1]

اسی طرح سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومٰتٌ ج فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ لا وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ط وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ط وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ز وَاتَّقُونِ يٰٓأُولِي الْأَلْبَابِ ○﴾

''حج کے مہینے (سب کو) معلوم ہیں، جو شخص ان مہینوں میں حج کرنے کا فیصلہ کرے، اسے چاہیے کہ اس پوری مدت میں شہوانی بات نہ کرے، اور نہ کوئی برا کام کرے، اور نہ لڑائی جھگڑا کرے، جو تم نیک کام کرتے ہو، اللہ اس کو (خوب) جانتا ہے، اور (حج کے لیے جانے سے پہلے) زادِ راہ لے لو، (یعنی راستے کا خرچ لے لو)، اور بہترین زادِ راہ تو اللہ کا خوف اور پرہیز گاری ہے۔ اور اے عقل والو! مجھ سے ڈرتے

[1] آلِ عمران 97:3

رہا کروں۔"[1]

حج پوری زندگی میں ایک بار فرض ہے۔صحیح بخاری میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ»

"جس شخص نے خالص اللہ کی خوش نودی کے لیے حج کیا،(اوران دنوں میں)نہ تو اس نے کوئی فحش بات کی اور نہ کوئی گناہ کا کام کیا تو وہ اس دن کی طرح واپس ہوگا جیسے اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔"[2]

اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ حج سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔مگر جوشرائط قرآن اور حدیث میں حج کے صحیح ہونے اور گناہ کے معاف ہونے کے لیے لگائی گئی ہیں، ان کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔اب جوشخص اللہ کی خوش نودی کے بجائے نام ونمود کے لیے یا کسی اور ناجائز غرض سے حج کرتا ہے، یا وہ برائیوں سے بچنے کی بجائے زمانۂ حج میں بھی برائیاں کرتا ہے، ایسے شخص کا حج بھلا کیسے قبول ہوسکتا ہےاوراس کے گناہ کیسے معاف ہو سکتے ہیں۔

حج جہاں اسلام کا چوتھا رکن ہے، وہاں دینِ اسلام کا ایک ستون بھی ہے۔یعنی اسلام کی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے، ان میں سے ایک حج ہے۔ظاہر ہے جب کسی چیز کی بنیاد کوگرا دیا جائے،تو وہ چیز گر جاتی ہے، کمزور ہوجاتی ہے۔اب جوآدمی صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود بغیر کسی عذر کے حج بیت اللہ سے جی چراتا ہےتووہ اسلام کی عمارت کومنہدم کرنا چاہتا ہے۔زبان سے اگرچہ وہ اس کا اقرارنہیں کررہا، لیکن اس کا فعل اسی بات کی عکاسی کررہا ہے۔ایسا آدمی اپنےعمل سے اللہ اوراس کے رسول ﷺ کی مخالفت کررہا ہے۔ایسے لوگوں کو اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

---

[1] البقرة 2:197

[2] صحيح البخارى ، الحج ، باب فضل الحج المبرور ، حديث :1521

اللہ تعالیٰ سورۃ النور میں فرماتا ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾

"(سنو!) جو لوگ حکمِ رسول ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں، انھیں اس بات سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ان پر کوئی زبردست آفت آ پڑے یا انھیں دردناک عذاب آ لے۔"[1]

نبیٔ کریم ﷺ نے حج کی صرف زبانی تاکید نہیں فرمائی بلکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خود حج کر کے دکھایا۔ حج کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس فرض سے قیامت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جس طرح قیامت کے دن لوگ ایک جگہ جمع ہوں گے، اسی طرح عرفات کے میدان میں سب لوگ ایک جگہ جمع ہو کر اسی تصور کو تازہ کرتے ہیں۔ حج کا ہر رکن اللہ کی فرماں برداری اور قیامت کی کسی نہ کسی ہولناکی کی یاد دلاتا ہے۔ اس سے اللہ کی محبت تازہ ہوتی ہے۔ آدمی میں خواہشاتِ نفس پر قابو پانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تواضع اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ صبر اور بردباری کی عادت پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے فائدے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حج فرض ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق ہے۔

(حج کے احکام و مسائل کے لیے دیکھیے، دارالسلام کی مطبوعہ کتاب۔ "حج و عمرہ")

---

[1] النور 63:24

حقوق الوالدین



بچہ جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو گوشت پوست کا ننھا سا وجود ہوتا ہے۔ جس میں نہ بولنے کی قوت ہوتی ہے نہ چلنے پھرنے کی سکت۔ اتنی طاقت بھی نہیں ہوتی کہ کچھ کھا ہی سکے۔ ایسے وقت میں ماں کا وجود اُس کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوتا ہے۔ وہ ہر لمحے اُس کی نگہبانی کرتی ہے، اُسے دودھ پلاتی ہے اور اس کی پرورش و نگہداشت کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ اُس کی راتوں کی نیند اور دن کا سکھ چین اُس کے لیے وقف ہو جاتا ہے۔ باپ کی شفقت اُسے زمانے کے سرد و گرم سے بچاتی ہے۔ اُس کی محبت کی چھاؤں اُسے ہر سختی، تکلیف اور رنج سے دور کر دیتی ہے۔ اُن دونوں کی پرورش کے نتیجے میں جب وہ شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اُسے صاف نظر آتا ہے کہ اُسے اس مقام تک پہنچانے والے اُس کے والدین ہیں۔

اُسے اس مقام تک پہنچانے والے والدین نے اپنے فرض کو پورا کیا، اب اُس پر ان کے کچھ حقوق ہیں۔ یہ حقوق اتنے اہم ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حق عبادت کے بعد دوسرے نمبر پر جس حق

کا ذکر کیا ہے وہ والدین کا حق ہے۔ والدین کا حق کیا ہے؟ یہی کہ اُن کے ساتھ حُسنِ سلوک کیا جائے، ان کا مکمل ادب و احترام کیا جائے۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ان کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے اور ہمیشہ ان کے سامنے سرِتسلیم خم کیا جائے۔

قرآن وحدیث سے یہ بات بہت واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ والدین سے حُسنِ سلوک سے رزق میں فراوانی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے، جب کہ والدین کی نافرمانی کرنے والا اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش نہ آنے والا اللہ کی رحمت سے دور ہوتا جاتا ہے اور بالآخر جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کے ساتھ، والدین سے حُسنِ سلوک نہ کرنے والے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے، اور یہ ناراضی اُس کی دنیا اور آخرت دونوں برباد کر دیتی ہے، اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم والدین کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھیں۔ اس معاملے میں قرآن وسنت سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے وہ ملاحظہ کیجیے۔

حقوق العباد میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ اور یہ اتنا اہم حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حقِ عبادت کے بعد جس حق کا ذکر کیا، وہ والدین کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ نساء میں فرماتا ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾

''اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔''①

بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا، اس میں بھی یہی حکم تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پکا وعدہ لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔''②

سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○ؕ﴾

① النساء 36:4 ② البقرة 83:2

''اور آپ کے رب نے حکم دیا ہے کہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر ہی جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو۔ اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم کر جس طرح انھوں نے مجھے رحمت اور شفقت سے بچپن میں پالا تھا۔''①

والدین کے حقوق میں قرآنِ کریم کی یہ دو آیات بہت ہی اہم ہیں۔ ان میں ایک تو اللہ کی عبادت کے بعد، والدین کے حقوق کا ذکر ہے۔ دوسرے ان حقوق کی کچھ تفصیل بھی ہے:

① ان میں سب سے پہلے والدین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ ہر معاملے میں ایسا رویہ اختیار کرنا کہ جس سے انھیں ناگواری اور گرانی نہ ہو، بلکہ انھیں مسرت اور خوشی کا احساس ہو۔ اس میں حسنِ سلوک کی ہر صورت کے اختیار کرنے اور بدسلوکی کی ہر صورت سے اجتناب کرنے کی تاکید ہے۔

② دوسرے نمبر پر بڑھاپے میں ان کے سامنے اُف تک کہنے سے روکا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچنے سے پہلے ایسا کرنے اور کہنے کی اجازت ہے، بلکہ والدین جوان ہوں یا بوڑھے، ہر عمر اور ہر مرحلے میں ان کے ادب و احترام کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہے اور ہرگز ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا جس سے ان کی بے ادبی اور گستاخی ہو۔ بڑھاپے کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ اس عمر میں والدین اولاد کی خدمت واطاعت کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں۔

③ جب والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اولاد جوانی کی ترنگ میں والدین کو زیادہ اہمیت نہیں

---

① بني إسرائيل 17:23، 24

دیتی، لہٰذا جوان اولاد اور بوڑھے والدین کے جذبات اور خواہشات میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ جوانی ایک تو دیوانی ہوتی ہے، دوسرے زندگی کے تجربات و مشاہدات سے عاری۔ جب کہ والدین سرد و گرم چکھ چکے ہوتے ہیں۔ وہ حالات و واقعات کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے ہوتے ہیں۔ عمر بھر کے تجربات و مشاہدات ان کی فکر میں اعتدال و توازن پیدا کر چکے ہوتے ہیں، لیکن جوان اولاد اپنے جذبات اور جوانی کے جوش میں والدین کے جذبات اور ان کے تجربات کو اہمیت نہیں دیتی، نتیجتاً باہم تصادم اور ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر والدین کی باتوں پر ناگواری کا اظہار عام اور اُف (ہُوں) کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ''اُف تک نہ کہو'' کہہ کر اسی بے ادبی اور گستاخی کا راستہ بند کیا ہے۔

④ جب والدین کی بات کے خلاف اپنے جذبات کے اظہار کے لیے ''ہوں'' تک کہنے کی اجازت نہیں ہے، تو ڈانٹنے ڈپٹنے کی اجازت کیوں کر ہو سکتی ہے؟

⑤ اس لیے کہا گیا ہے کہ ان سے قولِ کریم کہو، یعنی ادب و احترام سے گفتگو کرو اس میں بے ادبی اور گستاخی کا شائبہ نہ ہو۔

⑥ ان کے سامنے دل کی گہرائی سے عاجزی کے بازو بچھائے رکھو، یعنی ان کے سامنے ان کی رائے کے مقابلے میں تکبر اور سرکشی کے اظہار کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

⑦ ان کے حق میں دعا گو رہو کہ یا اللہ! جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا پوسا تو ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرما۔ اس کے لیے یہ دعا تجویز فرمائی:

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾

''پروردگار! ان پر رحم کر جس طرح انھوں نے مجھے رحمت اور شفقت سے بچپن میں پالا تھا۔''[1]

---

① بنی إسرائیل 24:17

والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے اور اس کے فضائل و فوائد کے بیان میں بہت سی احادیث آتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: سب کاموں میں اللہ جل شانہ کو کون سا کام سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الصَّلاَةُ عَلَى وَقْتِهَا» قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: «بِرُّ الْوَالِدَيْنِ» قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: «الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ»

''بر وقت نماز پڑھنا۔'' میں نے پوچھا: اس کے بعد کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا: ''والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔'' میں نے پوچھا: اس کے بعد کون سا عمل؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔''[1]

اللہ تعالیٰ والدین کی دعا کو قبولیت کا شرف بخشتا ہے۔ وہ اولاد کے حق میں ہو تب بھی اور ان کے خلاف ہو تب بھی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ثَلاَثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لاَشَكَّ فِيهِنَّ: دَعْوَةُ الْمَظْلُومِ وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ، وَدَعْوَةُ الْوَالِدِ عَلَى وَلَدِهِ»

''تین دعائیں ہیں، ان کی قبولیت میں کوئی شک نہیں: مظلوم کی دعا (ظالم کے خلاف)، مسافر کی دعا اور اپنے بیٹے کے خلاف باپ کی دعا۔''[2]

اسی لیے ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے:

«لاَ تَدْعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ، وَلاَ تَدْعُوا عَلَى أَوْلاَدِكُمْ، وَلاَ تَدْعُوا عَلَى أَمْوَالِكُمْ، لاَ تُوَافِقُوا مِنَ اللهِ سَاعَةً يُسْأَلُ فِيهَا

---

① صحیح البخاری، مواقیت الصلاۃ، باب فضل الصلاۃ لوقتها، حدیث: 527

② جامع الترمذی، البر والصلة، باب ماجاء فی دعوة الوالدین، حدیث: 1905

عَطَاءٌ فَيَسْتَجِيبُ لَكُمْ»

”تم اپنے لیے بددعا کرو، نہ اپنی اولاد کے لیے۔ اور نہ اپنے مالوں کے خلاف بددعا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم عین اس گھڑی میں بددعا کر ڈالو، جس میں کی جانے والی دعا کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔“ ①

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا:

أُبَايِعُكَ عَلَى الْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ، أَبْتَغِي الْأَجْرَ مِنَ اللهِ، قَالَ: «فَهَلْ مِنْ وَالِدَيْكَ أَحَدٌ حَيٌّ؟» قَالَ: نَعَمْ، بَلْ كِلَاهُمَا، قَالَ: «فَتَبْتَغِي الْأَجْرَ مِنَ اللهِ؟» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَارْجِعْ إِلَى وَالِدَيْكَ فَأَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا»

میں آپ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرتا ہوں اور اللہ سے اجر کا طالب ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”تیرے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟“ اس نے جواب دیا: ہاں، بلکہ دونوں ہی زندہ ہیں۔ آپ نے اس سے پوچھا: ”کیا تو واقعی اللہ سے اجر کا طالب ہے؟“ اس نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: ”پھر تو اپنے والدین کے پاس لوٹ جا اور ان کی اچھی طرح خدمت کر۔“ ②

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ایک دوسری روایت کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

”ایک آدمی آیا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں جانے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اس سے پوچھا:

① صحيح مسلم، الزهد، باب حديث جابر الطويل وقصة أبي اليسر، حديث:3009

② صحيح مسلم ، البر والصلة ، باب بر الوالدين وأيهما أحق به ، حديث :2549

«أَ حَيٌّ وَالِدَاكَ؟» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ»

''کیا تیرے ماں باپ زندہ ہیں؟'' اس نے جواب دیا: ہاں! آپ نے فرمایا: ''پھر انھیں میں جہاد کر۔'' یعنی ان کو خوش رکھنے کی کوشش کر۔ ①

مطلب یہ کہ جہاد عام حالات میں فرضِ کفایہ ہے، یعنی مسلمانوں کی پوری آبادی میں سے حسبِ ضرورت کچھ لوگ جہاد میں حصہ لے لیں، تو سب کی طرف سے جہاد کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اس صورت میں جہاد میں حصہ لینے کے لیے والدین کی اجازت کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کی خدمت فرضِ عین ہے۔ فرضِ کفایہ کی ادائیگی کے لیے فرضِ عین کو ترک کرنا جائز نہیں۔ حدیث میں اسی صورت کی طرف اشارہ تھا۔ ہاں بعض مخصوص حالات میں جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے، اس وقت والدین کی اجازت ضروری نہیں، کیونکہ اس وقت جہاد میں حصہ لینا ناگزیر ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب دشمن حد سے بڑھ جائے اور نظریاتی اور ملکی سرحدوں پر حملہ آور ہو۔

اسلام والدین کا اس قدر احترام کرنے کا حکم دیتا ہے کہ کسی دوسرے کے ماں باپ کو بھی برا کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَكْبَرِ الْكَبَائِرِ أَنْ يَلْعَنَ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ» قِيلَ: يَارَسُولَ اللهِ، وَكَيْفَ يَلْعَنُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: «يَسُبُّ الرَّجُلُ أَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ أَبَاهُ، وَيَسُبُّ أُمَّهُ فَيَسُبُّ أُمَّهُ»

''کبیرہ گناہوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے۔'' حاضرین نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کوئی شخص کیسے اپنے ماں باپ

① صحیح البخاری، الجهاد والسیر، باب الجهاد بإذن الوالدین، حدیث: 3004

کو گالی دیتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی صورت یہ ہے کہ ''وہ کسی دوسرے کے باپ کو گالی دے، کسی دوسرے کی ماں کو گالی دے اور وہ شخص پلٹ کر اس کے ماں باپ کو گالی دے (تو اس طرح وہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا سبب بنتا ہے۔)''①

انسان کی موت کے بعد ثواب کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، لیکن چند صورتوں میں ثواب کا سلسلہ قائم بھی رہتا ہے۔ اس بارے میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاَثَةٍ: إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»

''جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے سب اعمال ختم ہو جاتے ہیں، لیکن تین چیزوں کا (نفع اسے پہنچتا رہتا ہے۔) ❶ صدقہ جاریہ ❷ ایسا علم جس سے لوگ نفع حاصل کرتے ہوں۔ ❸ نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔''②

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام صحابہ اور تابعین کے دلوں پر پوری طرح نقش ہو گئے تھے، اس لیے وہ ہر ممکن حد تک والدین کے حقوق کی ادائیگی کرتے تھے اور ان کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں:

''فتح مکہ کے موقع پر نبی اکرم ﷺ جب مسجد حرام میں تشریف لائے، تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے والد ابو قحافہ کو لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انھیں دیکھا، تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم نے اپنے بوڑھے باپ کو گھر ہی میں کیوں نہ

① صحیح البخاری، الأدب، باب لایسب الرجل والدیه، حدیث: 5973، وصحیح مسلم، الإیمان، باب الکبائر وأکبرها، حدیث: 90

② صحیح مسلم، الوصیة، باب مایلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته حدیث: 1631

رہنے دیا، میں خود ان کے پاس آتا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اللہ کے رسول! آپ کے جانے کے مقابلے میں ان کا حق زیادہ تھا کہ وہ خود آپ کے پاس آئیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد کو اپنے سامنے بٹھایا اور ان کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور ان سے فرمایا: أَسْلِمْ ''اسلام قبول کرلو'' چنانچہ انھوں نے مسلمان ہونا قبول کرلیا۔''[1]

اس واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ بوڑھے اور کمزور والدین کی خدمت گزاری کی کس قدر اہمیت ہے۔ ضعیفی و پیری کی حالت میں ان کا سہارا بننا کس قدر عظیم عمل ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا عظیم المرتبت انسان اپنے بوڑھے والد کو خود اپنے ساتھ لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ والدین کا وجود انسان کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ والدین کی خدمت اور دعاؤں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اہلِ زمین کو بڑی بڑی مصیبتوں اور آزمائشوں سے دور رکھتا ہے۔

علامہ ابن جوزی اپنی کتاب صِفَةُ الصَّفْوَة میں سلامہ نامی راوی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک نوجوان نے اپنے والد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ میرے بہترین والد ہیں۔ میرے پاس گائیں ہیں، میں ان کا دودھ دوہتا ہوں اور اپنے بال بچوں کو پلانے سے پہلے اپنے باپ کے پاس لاتا ہوں، لیکن میرے والد نمازِ عشاء کے بعد نوافل میں مشغول ہو جاتے ہیں اور انھیں اتنا لمبا کر دیتے ہیں کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے اور میں ہاتھ میں دودھ کا پیالہ پکڑے ان کا انتظار کرتا رہتا ہوں اور وہ بدستور اپنی نماز میں مشغول رہتے ہیں۔

جب لڑکے کے والد سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو اس نے اپنے بیٹے کی تعریف کی اور کہا کہ میں ایسا کرنے کی وجہ بھی بیان کر دوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب میں نماز میں قرآن پڑھنا شروع کر دیتا ہوں تو میرے دل کو ایسی دلچسپی ہو جاتی ہے کہ میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔

---

[1] مسند أحمد: 349/6

سلامہ راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس واقعہ کا تذکرہ عبداللہ بن مرزوق سے کیا تو انھوں نے کہا: اسی قسم کے لوگوں کی وجہ سے اہلِ یمن امن وعافیت میں ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے ان کا ذکر سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے کیا تو انھوں نے فرمایا: ایسے نیک اور تقوی شعار لوگوں کی برکت ہی سے زمین بڑی بڑی مصیبتوں اور آفات سے محفوظ ہوتی ہے۔[1]

انسان پر والدین کی اطاعت اور عزت ہر حال میں لازم ہے۔ شرط یہ ہے کہ ان کی اطاعت اللہ کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اس بارے میں بھی اللہ کا حکم یہ ہے کہ مشرک والدین کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو اور بھلائی سے پیش آؤ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ العنکبوت میں فرماتا ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ﴾

''اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے اور (یہ بھی کہہ دیا کہ) اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے معبود کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہیں تو تُو ان کی اطاعت نہ کرنا۔''[2]

قرآنِ کریم کی یہ آیت، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ اٹھارہ انیس سال کے تھے کہ انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ جب ان کی والدہ حمنہ بنت سفیان کو معلوم ہوا کہ بیٹا مسلمان ہوگیا ہے تو اس نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے کہا، اللہ کی قسم! جب تک تُو محمد کا انکار نہیں کرے گا، تب تک میں نہ کچھ کھاؤں گی، نہ پیوں گی۔ ماں کا حکم ماننا، اس کا حق ادا کرنا اللہ کا حکم ہے، اگر تُو میری بات نہیں مانے گا تو اللہ کی نافرمانی کرے گا۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ یہ بات سن کر پریشان ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر ماجرا

---

[1] صفة الصفوة: 301/2 [2] العنكبوت 8:29

بیان کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

یہ صورتِ حال کئی اور مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آئی تھی، اس لیے اس مضمون کو سورۂ لقمان میں بھی دہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا﴾

''اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی چیز کو شریک کر، جس کا تیرے پاس کوئی علم نہیں تو ان کی بات نہ مان۔''[2]

والدہ، والد سے بھی زیادہ حسنِ سلوک کی مستحق ہے

اس سوال پر غور کرنا ہے کہ والد اور والدہ دونوں کے حقوق مساوی ہیں یا حسنِ سلوک کے اعتبار سے ان کے مابین کچھ فرق ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ والدہ انسان کے حسنِ سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے، اس لیے کہ حمل، وضعِ حمل اور پرورش کی تین تکلیفیں ایسی ہیں کہ جو صرف ماں ہی برداشت کرتی ہے، ان میں مرد کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ سورۂ احقاف میں یہ حقیقت یوں واضح کی گئی ہے:

﴿وَ وَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ اِحۡسٰنًا ؕ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِىۡۤ اَنۡ اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَىَّ وَعَلٰى وَالِدَىَّ﴾

''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے تکلیف جھیل کر پیٹ میں رکھا اور بڑی مشقت سے اسے جنا،

---

1. جامع الترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورۃ العنکبوت، حدیث: 3189
2. لقمان 15:31

اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے کا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اپنی کمالِ قوت کے زمانے کو اور چالیس سال کی عمر کو پہنچا تو کہنے لگا: اے میرے رب ! مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں۔''[1]

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کی احسان مندی کا ذکر اپنی احسان پذیری کے ساتھ کیا ہے۔ والدہ (ماں) کے بلند مقام کا بخوبی پتا اس حدیث سے چلتا ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

مَنْ أَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِي؟ قَالَ: «أُمُّكَ» قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: «ثُمَّ أُمُّكَ» قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: «ثُمَّ أُمُّكَ» قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: «ثُمَّ أَبُوكَ»

میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھاری والدہ حسنِ سلوک کی زیادہ مستحق ہے۔'' اس نے پوچھا، پھر کون؟ آپ نے فرمایا: ''تمھاری والدہ۔'' اس نے پوچھا، پھر کون؟ آپ نے فرمایا: ''تمھاری والدہ۔'' چوتھی مرتبہ سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا: ''پھر تمھارا باپ۔''[2]

اس سے ثابت ہوا کہ حسنِ سلوک اور احسان میں ماں، باپ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ حق دار ہے۔ وجہ یہی ہے کہ ماں اولاد کے لیے تین ایسی مشقتیں اٹھاتی ہے، جس میں مرد کا کوئی خاص حصہ نہیں ہوتا، یعنی حمل کی، جننے کی اور دودھ پلانے کی۔

---

[1] الأحقاف 15:46

[2] صحیح البخاری، الأدب، باب من أحق الناس بحسن الصحبة، حدیث: 5971، وصحیح مسلم، البر والصلة والأدب، باب بر الوالدین وأیهما أحق به، حدیث: 2548

ایک آدمی سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ کے پاس آیا،اس نے کہا: میرا والد میرے ساتھ رہ رہا ہے، اس نے میرا نکاح کردیا ہے،اب وہ مجھے بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیتا ہے۔یہ سن کر ابودرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں وہ نہیں کہ تجھے والدین کی نافرمانی کا حکم دوں اور نہ میں تجھے بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیتا ہوں،البتہ اگر چاہو تو بتا دیتا ہوں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

«اَلْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَحَافِظْ عَلَى ذٰلِكَ إِنْ شِئْتَ أَوْ دَعْ»

''والد جنت کا درمیانی دروازہ ہے، چاہو تو اس کی حفاظت کرو، چاہو تو اسے ضائع کردو۔''

عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرا خیال ہے کہ یہ بات سن کر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

میری زوجیت میں ایک بیوی تھی۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ جب کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے نفرت تھی۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا: اسے طلاق دے دو۔ میں نے انکار کردیا۔ تب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بات کا ذکر کیا۔آپ نے مجھ سے فرمایا: ''اسے طلاق دے دو'' چنانچہ میں نے اسے طلاق دے دی۔[2]

والدین سے حسنِ سلوک، عمر میں درازی اور رزق میں فراوانی کا سبب ہے۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

① صحیح ابن حبان، (الإحسان):327,326/1

② جامع الترمذی، الطلاق واللعان، باب ماجاء فی الرجل یسأله أبوه أن یطلق زوجته، حدیث: 1189، وسنن ابن ماجه، الطلاق، باب الرجل یامره أبوه بطلاق امرأته، حدیث: 2088

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُمَدَّ لَهُ فِي عُمُرِهِ، وَأَنْ يُزَادَ لَهُ فِي رِزْقِهِ فَلْيَبَرَّ وَالِدَيْهِ وَلْيَصِلْ رَحِمَهُ»

"جسے یہ بات پسند ہے کہ اس کی عمر دراز ہو، اور اس کے رزق میں کشادگی ہو تو اسے چاہیے کہ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور صلہ رحمی کیا کرے۔"[1]

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ، وَلَا يَزِيدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ»

"قضا کو صرف دعا ہی رد کرسکتی ہے اور عمر میں اضافہ صرف نیکی ہی سے ہوسکتا ہے۔"[2]

چونکہ ماں باپ کی خدمت بہت بڑی نیکی ہے اس لیے اس سے عمر میں اضافہ ہوگا۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ جس طرح والدین سے حسنِ سلوک اس قدر فضیلت کا باعث ہے کہ اس سے رزق میں فراوانی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے اسی طرح والدین کی نافرمانی اور ان سے حسن سلوک کا برتاؤ نہ کرنا بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے کہ انسان اس سے رحمت الٰہی سے دور اور جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔

سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

صَعِدَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْمِنبَرَ فَلَمَّا رَقِيَ عَتَبَةً قَالَ: «آمِين» ثُمَّ رَقِيَ أُخْرَى فَقَالَ: «آمِين» ثُمَّ رَقِيَ عَتَبَةً ثَالِثَةً فَقَالَ: «آمِين» ثُمَّ قَالَ: «أَتَانِي جِبْرِيلُ فَقَالَ: يَامُحَمَّدُ! مَنْ أَدْرَكَ رَمَضَانَ فَلَمْ يُغْفَرْ لَهُ، فَأَبْعَدَهُ اللهُ فَقُلْتُ: آمِين، قَالَ: وَمَنْ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ أَوْ أَحَدَهُمَا فَدَخَلَ النَّارَ، فَأَبْعَدَهُ اللهُ فَقُلْتُ: آمِين، قَالَ: وَمَنْ

---

[1] مسند أحمد: 229/3

[2] جامع الترمذي، القدر، باب ماجاء لا يرد القدر إلا الدعاء، حديث: 2139

ذُكِرْتَ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْكَ ، فَأَبْعَدَهُ اللهُ فَقُلْتُ : آمِينَ»

رسولِ اکرم ﷺ منبر پر چڑھے اور جب آپ نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو کہا: ''آمین۔'' جب آپ نے دوسری سیڑھی پر قدم رکھا تو کہا: ''آمین۔'' پھر جب تیسری سیڑھی پر قدم رکھا تو بھی کہا: ''آمین۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس جبریل آئے اور کہا: اے محمد (ﷺ)! جو شخص رمضان کا مہینہ پائے اور (روزے رکھ کر) اپنے گناہ نہ بخشوائے اللہ اسے اپنی رحمت سے دور رکھے۔ میں نے کہا: آمین۔ اور جو شخص اپنے والدین یا دونوں میں سے کسی ایک کو (بڑھاپے) میں پائے اور (ان سے حسنِ سلوک نہ کرنے کی وجہ سے) وہ آگ میں داخل ہو جائے، اللہ اسے اپنی رحمت سے دور رکھے۔ میں نے کہا: آمین۔ اور جس آدمی کے پاس آپ کا ذکر کیا جائے اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے، اللہ اسے بھی اپنی رحمت سے دور رکھے۔ میں نے کہا: آمین۔''[1]

یہ کس قدر خوفناک بات ہے کہ جبریل علیہ السلام دعا کریں اور نبی کریم ﷺ ان کی دعا پر آمین کہیں۔ اب ان تینوں دعاؤں کی قبولیت میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے، ان لوگوں کو فوراً توبہ کر لینی چاہیے جو بوڑھے ماں باپ کو دکھ دیتے ہیں، ستاتے ہیں۔ صحیح بخاری میں سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ بیان کرتی ہیں:

میری والدہ میرے پاس آئیں، وہ ابھی مشرکہ تھیں۔ ایمان نہیں لائی تھیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یہ ابھی تک مشرکہ ہیں اب ان کے بارے میں میرے لیے کیا حکم ہے، کیا میں اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔''[2]

---

[1] صحيح ابن حبان:409،وصححه الألباني في صحيح الترغيب والترهيب ، حديث :996

[2] صحيح البخاري ، الأدب ، باب صلة الوالد المشرك ، حديث :5979،5978

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کی رضا مندی، والدین کی رضامندی میں ہے اور اللہ کی ناراضی والدین کی ناراضی میں ہے۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے وجود پذیر ہونے کا ظاہری سبب اس کے والدین ہیں، انسان جب دنیائے رنگ و بو میں قدم رکھتا ہے تو نہ بول سکتا ہے اور نہ کسی کی بات سمجھ سکتا ہے، یہاں تک کہ کچھ کھا بھی نہیں سکتا۔ اس وقت ماں ہی اسے چھاتی سے لگاتی اور اپنے دودھ سے اسے سیراب کرتی ہے اور باپ کا سایۂ شفقت ہی اس کی پناہ گاہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں مل کر اس کی پرورش کرتے ہیں، اس کے کہے بغیر اس کی خوراک کا، اس کے بتلائے بغیر اس کے علاج کا اور اس کی خواہش کے بغیر اس کی صفائی اور لباس اور دیگر ضروریات کا انتظام کرتے ہیں۔ بڑے ہونے اور شعور کی آنکھیں کھولنے کے بعد انسان کا فرض بنتا ہے کہ وہ والدین کے اس احسان کا بدلہ احسان کے ساتھ دے اور وہ احسان یہی ہے کہ ان کا ادب و احترام، ان کی اطاعت و فرماں برداری اور ان کی خدمت و ناز برداری کرے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کے ساتھ، والدین کے ساتھ یہ حسنِ سلوک اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا ذریعہ ہے۔ اگر اس نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا یہ معاملہ نہ کیا اور والدین کو ناراض کرلیا، تو عبادت وریاضت کے باوجود، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ناراض ہو، وہ سوچ لے اس کا انجام کیا ہے؟

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے عرض کیا:

---

[1] جامع الترمذی، حدیث:1899، صححه الألباني فی سلسلة الأحادیث الصحیحة ، حدیث: 516

يَارَسُولَ اللهِ! إِنِّي أَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِيمًا فَهَلْ لِي تَوْبَةٌ؟ قَالَ: «هَلْ لَكَ مِنْ أُمٍّ؟» قَالَ: لاَ، قَالَ: «هَلْ لَكَ مِنْ خَالَةٍ؟» قَالَ: نَعَمْ قَالَ: «فَبِرَّهَا»

اے اللہ کے رسول! میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔کیا میرے لیے توبہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:''کیا تیری ماں ہے؟'' اس نے کہا،نہیں۔آپ نے فرمایا:''کیا تیری خالہ ہے؟'' اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا:''پھر اس سے نیک سلوک کرو۔''[1]

یعنی خالہ کی خدمت کرنے سے تمھارا گناہ معاف ہوجائے گا۔ جب خالہ کے ساتھ حسنِ سلوک اس قدر اجر و ثواب کا باعث ہے تو والدہ کے ساتھ حسنِ سلوک کس قدر عظیم عمل ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک اعرابی کی ملاقات مکہ مکرمہ کے راستے میں ہوئی۔اس نے انھیں سلام کیا۔آپ نے اسے اپنی سواری پر بٹھالیا۔اپنا عمامہ بھی اسے عطا کیا۔ان سے پوچھا گیا،اللہ آپ کا بھلا کرے یہ اعرابی لوگ تو معمولی سے عطیے سے بھی خوش ہوجاتے ہیں، آپ نے اسے اپنا عمامہ دے دیا؟ یہ سوال سن کر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا باپ میرے والد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا دوست تھا اور میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

«إِنَّ أَبَرَّ الْبِرِّ صِلَةُ الْوَلَدِ أَهْلَ وُدِّ أَبِيهِ»

''سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ اولاد اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔''[2]

---

[1] جامع الترمذی، البر والصلة، باب فی بر الخالة، حدیث: 1904

[2] صحیح مسلم، البر والصلة، باب فضل صلة أصدقاء الأب والأم ونحوهما، حدیث: 2552

سیدنا ابوبردہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں ایک مرتبہ مدینہ منورہ آیا تو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: جانتے ہو کہ میں کیوں آیا ہوں؟ میں نے کہا: نہیں۔ انھوں نے فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَصِلَ أَبَاهُ فِي قَبْرِهِ فَلْيَصِلْ إِخْوَانَ أَبِيهِ بَعْدَهُ وَإِنَّهُ كَانَ بَيْنَ أَبِي عُمَرَ وَبَيْنَ أَبِيكَ إِخَاءٌ وَوُدٌّ فَأَحْبَبْتُ أَنْ أَصِلَ ذَاكَ»

''جو شخص اپنے والد کی وفات کے بعد اس سے صلہ رحمی کرنا چاہے تو وہ اپنے والد کے دوستوں سے صلہ رحمی کرے اور بات یہ ہے کہ میرے والد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور آپ کے والد کے درمیان دوستی اور محبت تھی، لہٰذا میں نے چاہا کہ اس تعلق کو برقرار رکھوں۔''[1]

یہ تو بہت ہی مشہور حدیث ہے، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور حدیث کی دوسری کتب میں بھی موجود ہے:

''تین آدمی سفر پر نکلے کہ شدید بارش نے انھیں آلیا۔ انھوں نے ایک غار میں پناہ لی، اچانک غار کے منہ پر ایک بھاری پتھر لڑھک آیا اور ان کے باہر نکلنے کی جگہ نہ رہی۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس پتھر سے چھٹکارا تب ہی ممکن ہے جب ہم اپنے اپنے کسی نیک عمل کا واسطہ دے کر دعا کریں، اس لیے اپنا اپنا وہ عمل یاد کرو، جو تم نے خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاطر کیا تھا۔ اس کے وسیلے سے دعا کرو، شاید اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے نجات عطا فرمادے۔ چنانچہ ایک نے دعا کی: میرے ماں باپ بوڑھے تھے، میں اپنے بال بچوں سے پہلے انھیں دودھ پلاتا تھا۔ ایک روز چارے کی تلاش میں مجھے دیر ہوگئی، جب میں واپس لوٹا تو وہ سو چکے تھے، میں نے دودھ نکالا، اور جب ان کے پاس لے کر آیا تو وہ سو رہے تھے۔ میں

---

[1] صحيح ابن حبان (الإحسان):1/329

نے پسند نہ کیا کہ ان سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ پلاؤں، چنانچہ رات بھر پیالہ ہاتھ میں لیے کھڑا رہا اوران کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔ بچے میرے قدموں میں بھوکے پڑے رو رہے تھے۔ آخر کار صبح ہوئی، وہ جاگے اور انھوں نے اپنے حصے کا دودھ پیا، تب میں نے بچوں کو پلایا۔ اے اللہ! اگر میں نے یہ عمل تیری رضا اور خوشنودی کی خاطر کیا تھا تو تُو ہم سے اس پتھر کو ہٹا دے، چنانچہ وہ پتھر تھوڑا سا سرک گیا۔

دوسرے نے چچا کی بیٹی سے بدکاری کا ارادہ کیا تھا، لیکن اللہ کے خوف سے رک گیا، اس نے اس عمل کو یاد کرکے دعا کی، پتھر کچھ اور سرک گیا۔

تیسرے کے پاس ایک مزدور کی اجرت تھی، جسے مزدور نے کم اُجرت کا بہانہ کرکے لینے سے انکار کردیا تھا، چنانچہ اس نے وہ اجرت تجارت پر لگا دی، جس سے بہت زیادہ مال جمع ہوگیا اور جب مزدور نے اس سے دوبارہ اپنی اجرت طلب کی تو اس نے وہ سارا مال جو اس تجارت سے جمع ہوا تھا، مزدور کو واپس کردیا۔ اس نے اپنی اس نیکی کو یاد کرکے دعا کی، چنانچہ وہ پتھر اور سرک گیا اور وہ باہر نکل آئے۔''[1]

ان تمام روایات، حالات اور واقعات سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ والدین کے ساتھ ہر حال میں نیک سلوک کیا جائے، ورنہ نجات ممکن نہیں۔

[1] صحيح البخاري، البيوع، باب إذا اشترى شيئا لغيره بغير إذنه فرضي، حديث: 2215 (مختصرًا) وصحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب قصة أصحاب الغار الثلاثة والتوسل بصالح الأعمال، حديث: 2743

حقوق الزوجین



ہم دنیا کے معاشروں کا جائزہ لیں تو دیگر اخلاقی گراوٹوں کے ساتھ ساتھ عورت کی کمزور اور بدتر حیثیت ایک واضح تصویر کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ سابقہ ادوار میں بھی اور موجودہ دور میں بھی عورت لوگوں کے لیے تفریح کا باعث تو نظر آتی ہے لیکن عزت کا باعث نہیں۔ عورت کی تحقیر اور توہین اکثر قوموں میں معمول کی بات تھی، اور شاید اب بھی ہے۔ اسلام وہ واحد دین ہے جس نے عورت کو احترام، وقار اور مرتبہ دیا۔ اُسے پاکیزگی اور تقدس کے زیور سے آراستہ کیا اور اس کے احترام کو نسلِ نو کے لیے ناگزیر اہمیت کا حامل قرار دیا۔

مرد طاقت کی علامت ہوتا ہے۔ طاقت اور قوت کا یہ اختیار بعض اوقات اُس کے ذہن کو غلط سمت میں موڑ دیتا ہے۔ اُس کے رویے سے، اُس کی ہر ہر بات سے اور اُس کی سوچ سے برتری کا احساس جھلکنے لگتا ہے۔ اس احساس کا سب سے پہلا شکار بیوی ہوتی ہے۔ اُس سے بات منوانا، اپنے ہر حکم کی تعمیل چاہنا، اُس کی خامیوں کو ہر وقت تنقید کا نشانہ بنائے رکھنا، مرد اپنا حق سمجھتا ہے۔ یہ

طرزِ عمل جہاں عورت کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے وہاں مرد بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

عورت کی تقدیس اور احترام کے حوالے سے نبی مہرباں ﷺ نے ہماری مکمل رہنمائی فرمائی ہے۔ بیوی کے حقوق کیا ہوتے ہیں؟ کس موقع پر اُس سے کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اُس کے ساتھ کس طرح کی طرزِ معاشرت ہو۔ نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر اُن حقوق کی ادائیگی ہمیں سکھائی ہے۔

ازدواجی رشتے کو اِستحکام دینے اور خانگی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے خاوند کا اُن حقوق کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ بیوی کے حقوق کے ساتھ ساتھ، خاوند کے حقوق بھی ہیں۔ بیوی اگر ان حقوق کا خیال رکھے تو اُن کی زندگی میں ہمیشہ بہار کا سماں رہے گا۔ غم کی خزاں اُن کے سائے سے بھی دور رہے گی، اور ان کا گھرانا سدا خوشیوں سے مہکتا رہے گا۔ لیکن یہ ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی سے مشروط ہے۔ آیئے! اپنے اپنے حقوق جان کر انھیں ادا کرنے کی کوشش کریں۔

نبیٔ کریم ﷺ کی بعثت کے وقت ساری دنیا اور خاص طور پر عرب میں عورتوں کی حالت انتہائی بدتر تھی۔ عرب کے لوگ اپنی نومولود بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ایرانی اور بازنطینی حکومتوں میں بھی عورت حقیر ترین مخلوق تصور کی جاتی تھی۔ ہندوستان میں خاوند کے مرنے کے بعد بیوی کو بھی خاوند کے ساتھ زندہ جل مرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اس کو ستی کی رسم کہا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے کی قوموں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ مرد اور عورت دونوں آدم علیہ السلام کی اولاد اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ ان کا ازدواجی تعلق انسانی معاشرے کی بنیاد ہے۔ ایسے حالات میں نبیٔ اکرم ﷺ سراپا رحمت بن کر آئے۔ آپ ﷺ نے دور رس اصلاحات کیں اور دنیا کو درس دیا کہ کس طرح ہمہ وقت اور ہمہ جہت مصروفیات کے باوجود ازدواجی زندگی خوش گوار بنائی جا سکتی ہے۔

نبیٔ کریم ﷺ کی تعلیمات کا بنیادی عُنصر عورتوں کا احترام تھا۔ آپ نے عین جوانی کے عالم میں ڈھلتی عمر کی بیوہ سے شادی کی، جنھیں اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ان کی زندگی میں آپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ آپ کی ازواجِ مطہرات کو امہات المومنین کہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ عورت کے رشتے کو کس قدر مقدس بنا دیا گیا ہے۔ خواتین میں نبیٔ کریم ﷺ کی بیٹی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جو مقام حاصل کیا، اس کی بنیاد پر انھیں جنت کی عورتوں کی سردار قرار دیا گیا۔ سیدہ فاطمہ

الزہرا ؓ جب نبی کریم ﷺ سے ملنے کے لیے آتیں تو آپ اٹھ کر ان سے ملتے۔

مردوں کو عورتوں پر فوقیت اس بنا پر ہے کہ مرد کار زارِ حیات میں ہمہ تن سرگرم رہتا ہے اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے اس پر بے شمار ذمے داریاں ہیں، ورنہ دونوں کے حقوق مساوی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ النساء میں فرماتا ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ﴾

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد (عورتوں پر) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔''[1]

اس آیت میں مرد کی حاکمیت وقوامیت کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک وہبی ہے جو مردانہ قوت اور دماغی صلاحیت ہے، اس میں مرد عورت سے خلقی (پیدائشی) طور پر ممتاز ہے۔ دوسری وجہ کسبی ہے، جس کا مکلّف شریعت نے مرد کو بنایا ہے اور عورت کو اس کی فطری کمزوری اور مخصوص تعلیمات کی وجہ سے، جو اسلام نے عورت کی عفت وحیا اور اس کے تقدس کے تحفظ کے لیے ضروری بتلائی ہیں، عورت کو معاشی جھمیلوں سے دور رکھا ہے۔ عورت کی حاکمیت کے خلاف قرآنِ کریم کی یہ نص قطعی اور بالکل واضح ہے جس کی تائید صحیح بخاری کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»

''وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہوگی، جس نے اپنے امور عورت کے سپرد کر دیے۔''[2]

سورۃ النساء ہی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] النساء 34:4

[2] صحیح البخاری، المغازی، باب کتاب النبی ﷺ إلی کسرٰی و قیصر، حدیث: 4425

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ۗ﴾

''جو کچھ مردوں نے کمایا، اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا، اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ اور اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو۔''[1]

اس آیت کی شانِ نزول میں بتایا گیا ہے کہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ مرد جہاد میں حصہ لیتے ہیں اور شہادت پاتے ہیں ہم عورتیں ان فضیلت والے کاموں سے محروم ہیں، ہماری میراث بھی مردوں سے نصف ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے جو جسمانی قوت و طاقت اپنی حکمت و مشیّت کے مطابق عطا کی ہے اور جس کی بنیاد پر وہ جہاد بھی کرتے ہیں اور دیگر بیرونی کاموں میں حصہ لیتے ہیں یہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے عورتوں کو مردانہ صلاحیتوں کے کام کرنے کی آرزو نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیکی کے کاموں میں خوب حصہ لینا چاہیے اور اس میدان میں وہ جو کچھ کمائیں گی، مردوں کی طرح ان کا پورا پورا صلہ انھیں ملے گا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرنا چاہیے کیونکہ مرد اور عورت کے درمیان استعداد و صلاحیت اور قوتِ کار کا جو فرق ہے، وہ تو قدرت کا ایک اٹل فیصلہ ہے، جو محض آرزو سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کے فضل سے کسب اور محنت میں رہ جانے والی کمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

اسلام نے عورت کو بیوی کی حیثیت میں بہت سے حقوق سے نوازا ہے۔ مثلاً حسنِ معاشرت، تفریح اور دل بستگی کے مواقع فراہم کرنا، معاشی تحفظ، ازدواجی معاملات میں عدل اور توازن۔

---

[1] النساء 32:4

[2] مسند أحمد: 322/6

نکاح میاں اور بیوی کے درمیان عہد ہوتا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے تحت خوش گوار ازدواجی تعلقات قائم رکھیں گے، اسی کو حسنِ معاشرت کہا جاتا ہے۔ سورۃ النساء میں اس معاہدے کی یاد دہانی ان الفاظ میں کرائی گئی:

﴿وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

''اوران کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔''[1]

سورۃ البقرہ میں خاوند اور بیوی کے تعلق کو انتہائی بلیغ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾

''وہ (عورتیں) تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو۔''[2]

مطلب یہ ہے کہ خاوند اور بیوی ایک دوسرے کے لیے ستر پوش بھی ہیں اور زینت کا سبب بھی۔

اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے ارشادات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا ، وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ»

''تم میں سب سے زیادہ کامل ایمان والا شخص وہ ہے، جو سب سے زیادہ با اخلاق ہے اور تم میں بہتر وہ ہے، جس کا سلوک اپنے اہل سے سب سے اچھا ہے۔''[3]

نبی کریم ﷺ کو ازواجِ مطہرات کا اتنا خیال تھا کہ ایک مرتبہ سفر میں اونٹ چلانے

---

[1] النساء 19:4 [2] البقرة 187:2

[3] جامع الترمذی، الرضاع ، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها ، حديث : 1162

والے اونٹ کو تیز ہانکنے لگے۔ اونٹ پر ازواجِ مطہرات سوار تھیں۔ آپ ﷺ نے اپنے غلام اَنْجَشَہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

«وَيْحَكَ يَا أَنْجَشَةُ! رُوَيْدَكَ سَوْقًا بِالْقَوَارِيرِ»

''افسوس! اَنْجَشَہ! شیشوں (نازک اندام عورتوں) کو آہستگی سے لے کر چل۔''[1]

ازدواجی تعلق کی سب سے مضبوط بنیاد محبت کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ موجود ہو تو زندگی کے میدان میں اکٹھے سفر جاری رکھ سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اعلیٰ مقصد یعنی اولاد کی تربیت پر اچھے اثرات بھی مرتب کر سکتے ہیں۔ محبت کا جذبہ نہ ہو تو یہ تعلق ایسے ہوگا، جیسے دو اجنبی کسی سفر کے دوران میں مل بیٹھے ہوں۔

بیوی کا حق یہ ہے کہ اس کا شوہر اسے شریکِ محبت رکھے، ہاں یہ بات بھی خارج از امکان نہیں کہ جب میاں بیوی مل جل کر رہیں، تو آپس میں اختلافات رنجشیں اور بدگمانیاں پیدا ہو جائیں۔ اگر خدانخواستہ اختلافات پیدا ہو جائیں اور وہ بڑھ جائیں تو شوہر کو چاہیے کہ اس مسئلے کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائے، بلکہ صلح کرنے میں پہل کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ﴾

''صلح بہت بہتر ہے۔''[2]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝﴾

---

[1] صحيح البخاري، الأدب ، باب مايجوز من الشعر والرجز والحداء ومايكره منه حديث : 6149،وصحيح مسلم، الفضائل ، باب رحمته ﷺ النساء وأمره بالرفق بهن ، حديث : 2323

[2] النساء 128:4

''اور ان کے ساتھ معقول طریقے سے زندگی بسر کرو، پھر اگر وہ تمھیں کسی وجہ سے ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناپسند ہو، مگر اللہ نے تمھارے لیے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔'' ①

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ»

''کوئی مسلمان شوہر اپنی مسلمان بیوی سے نفرت نہ کرے، اگر اسے اس کی ایک عادت پسند نہیں، تو دوسری اور عادتیں پسندیدہ ہوں گی۔'' ②

مطلب یہ کہ اگر عورت خوب صورت نہیں ہے یا جھگڑالو ہے، یا اس میں کوئی اور خامی ہے، تو اس وجہ سے اس سے قطع تعلقی کا فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے، بلکہ نباہ کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کوئی خوبی وقت کے ساتھ ظاہر ہو۔ یعنی عین ممکن ہے کہ اس سے ایسی اولاد پیدا ہو، جو شوہر کی عزت میں اضافے کا سبب بن جائے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے کہ شوہر بلاوجہ بیوی کو طلاق نہ دے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ أَعْظَمَ الذُّنُوبِ عِنْدَ اللهِ رَجُلٌ تَزَوَّجَ امْرَأَةً فَلَمَّا قَضَى حَاجَتَهُ مِنْهَا طَلَّقَهَا وَذَهَبَ بِمَهْرِهَا»

''اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی کسی عورت سے نکاح کرے، پھر جب اپنی ضرورت پوری کر لے، تو اسے طلاق دے دے اور اس کا مہر بھی ادا نہ کرے۔'' ③

① النساء 19:4

② صحيح مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء، حديث: 1467

③ المستدرك للحاكم: 182/2

یعنی بلا عذر طلاق کے ساتھ ساتھ مہر بھی غصب کر لیا، اللہ کے ہاں بہت بڑا گناہ ہے۔ ہاں اگر کوئی شرعی عذر ہو تو طلاق دینے کی اجازت ہے۔ لیکن مہر ادا کرنا ضروری ہوگا۔

اسلام میں ہر شخص کو دوسرے سے مساوات اور لطف و کرم کے معاملے کی تلقین کی گئی ہے۔ بیوی کے معاملے میں تو اور بھی محتاط ہونا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کے احکام جو حسنِ سلوک اور مساوات کے بارے میں تھے، اُن کی بنا پر بعض گھریلو معاملات میں بیویوں نے شوہروں کے مشوروں میں اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ صحیح بخاری میں ہے:

> ایک مرتبہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دبدبے کے باوجود ان کی زوجہ نے ان سے کسی معاملے میں اختلاف کیا، تو انھوں نے برہم ہو کر کہا: تجھے میرے معاملے میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ بیوی نے یہ سن کر کہا: میرے اختلاف سے آپ کو تعجب ہوا، حالانکہ آپ کی صاحب زادی حفصہ رضی اللہ عنہا رسولِ اکرم ﷺ سے اختلاف کرتی ہے اور بعض اوقات نبی کریم ﷺ اس اختلاف کی وجہ سے دن بھر ناراض رہتے ہیں۔ [1]

اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیوی کا عام گھریلو معاملے میں شوہر سے اختلاف کرنا معیوب نہیں، نبی کریم ﷺ کے اندازِ معاشرت سے بھی یہی ثابت ہے۔

ازدواجی رشتوں کو استوار کرنے اور خانگی زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے ضروری ہے کہ خاوند اپنی بیوی کے لیے مناسب اور موزوں سامانِ تفریح مہیا کرے۔ سنن ابی داود میں آتا ہے:

> ''نبی کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دوڑ لگائی، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا جسم اس وقت دبلا پتلا تھا، اس لیے دوڑ میں آگے نکل گئیں۔ کچھ مدت بعد پھر دوڑ لگی تو پیچھے رہ گئیں، اس لیے کہ اس وقت جسم کچھ فربہ ہو گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ اس دوڑ کا بدلہ ہے۔'' [2]

---

1. صحيح البخاري، التفسير، باب (تبتغي مرضات أزواجك) ......، حديث: 4913
2. سنن أبي داود، الجهاد، باب في السبق على الرجل، حديث: 2578

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے عید کے موقع پر گھر کی دیوار کی اوٹ سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو حبشیوں کی جنگی ورزش کا منظر دکھایا۔ مطلب یہ کہ اہل و عیال کو خوش رکھنا بھی نبی کریم ﷺ کے نزدیک دینی خدمت تھی۔ اس حقیقت کا اظہار جامع ترمذی کی اس حدیث سے ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا ، وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَاءِهِمْ»

”ایمانداروں میں ایمان کے لحاظ سے کامل وہ ہیں جو اخلاق کے لحاظ سے اچھے ہیں اور تم میں بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہیں۔“[1]

رسول اللہ ﷺ اپنی بیویوں کی دلجوئی کے لیے گھر کے کام کاج میں تعاون فرماتے تھے۔ کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اپنے کپڑے خود دھو لیتے تھے، پیوند خود لگا لیتے تھے۔ بکری کا دودھ دوہ لیتے تھے۔ اپنی اونٹنی خود باندھتے تھے۔ خادم کے ساتھ ایک برتن میں کھانے میں کوئی تکلف نہیں تھا۔ اپنے گھر کی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے، یعنی خود تکلیف برداشت کر لیتے تھے، لیکن دوسروں کا خیال رکھتے تھے۔

گھر کا نظام چلانے کے لیے سرمایہ فراہم کرنا مرد کی ذمہ داری ہے۔ عورت کا فرض یہ ہے کہ خوش اسلوبی سے گھر کا بندوبست کرے کیونکہ گھریلو معاملات کی وہ ذمہ دار اور نگران ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ : الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا»

[1] جامع الترمذی، الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجھا ، حدیث : 1162

''تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اس کے ماتحتوں کے متعلق اس سے سوال ہوگا۔ امام نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ مرد اپنے گھر کا نگہبان ہے، اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا۔''①

مرد کے ذمے ایک اہم کام یہ ہے کہ وہ تگ و دو کر کے اہل و عیال کے لیے حلال روزی مہیا کرے۔ نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کو دیگر حقوق کی یاد دہانی کراتے ہوئے فرمایا تھا:

«وَإِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا»

''اور تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے۔''②

ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ ہم میں سے کسی شخص کی بیوی کا اس پر کیا حق ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ، وَتَكْسُوَهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ وَلاَ تَضْرِبِ الْوَجْهَ، وَلاَ تُقَبِّحْ، وَلاَ تَهْجُرْ إِلاَّ فِي الْبَيْتِ»

''جب تُو کھائے، اسے بھی کھلائے، جب تُو پہنے تو اسے بھی پہنائے، اس کے چہرے پر نہ مارے، اسے برا بھلا نہ کہے اور اس سے علیحدگی اختیار کرنی پڑے، تو گھر کے اندر ہی کرے۔''③

بال بچوں کی پرورش رزقِ حلال سے کرنا عبادت کا اونچا مقام ہے۔ اس بات کی

---

① صحيح البخاري ، الجمعة ، باب الجمعة في القرى والمدن ، حديث : 893

② صحيح البخاري ، الصوم ، باب حق الضيف في الصوم ، حديث : 1974

③ سنن أبي داود ، النكاح ، باب في حق المرأة على زوجها ، حديث : 2142

وضاحت صحیح مسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«دِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَدِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِي رَقَبَةٍ، وَدِينَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهِ عَلَى مِسْكِينٍ، وَدِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ عَلَى أَهْلِكَ أَعْظَمُهَا أَجْرًا الَّذِي أَنْفَقْتَهُ عَلَى أَهْلِكَ»

''ایک دینار وہ ہے جو تو نے جہاد پر خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جس سے کسی غلام کو آزادی دلائی، اور ایک دینار وہ ہے جو تو کسی مسکین پر صدقہ کرے اور ایک دینار وہ ہے جو تُو نے بیوی بچوں پر خرچ کیا۔ اجر کے اعتبار سے سب سے بڑا دینار وہ ہے جسے تُو نے اپنے اہل پر خرچ کیا۔''[1]

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ ہر کام متوازن ہونا چاہیے۔ اعتدال کا راستہ سب سے بہتر راستہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۃ الاعراف میں فرماتا ہے:

﴿وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا﴾

''کھاؤ، پیو اور اسراف نہ کرو۔''[2]

سورۂ بنی اسرائیل میں یہی حکم اس طرح ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے۔''[3]

اس آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان نہ تو بخیل بن کر دولت کی گردش کو روکے اور نہ فضول خرچ بن کر اپنی معاشی طاقت ضائع کرے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی ان احکام کی

---

① صحيح مسلم، الزكاة، باب فضل النفقة على العيال ......، حديث: 995

② الأعراف 7:31 ③ بني إسرائيل 17:29

عملی تصویر تھی، چنانچہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت یہ تھی کہ انسانوں کے معاملے میں تو زرخیز زمین کی طرح فیاض تھے، مگر گھر کے ساز و سامان اور لباس کے معاملے میں کم پیداوار دینے والی زمین کی طرح تھے۔

مطلب یہ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اعتدال کے پہلو کو یوں قائم رکھا کہ اہل و عیال اور لوگوں پر تو کھلے دل سے خرچ کرتے تھے مگر گھر کی آرائش اور لباس کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔

عدل و مساوات کا برتاؤ کرنا

عدل انسان کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس کو ازدواجی تعلقات میں بھی جاری و ساری رکھنا چاہیے۔ عورت کا حق یہ ہے کہ مرد اس کے ساتھ مکمل مساوات رکھے۔ کھانے، پینے، لباس اور ہر معاملے میں مساوات کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے۔ یہاں لباس کے معاملے میں وضاحت کر دی جائے۔ عدل اور مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ مرد کھدر پہنے تو عورت بھی یہی کپڑا پہنے، بلکہ عدل یہ ہے کہ مرد وہ کپڑا پہنے جو عام مرد پہنتے ہیں اور عورت وہ لباس اختیار کرے جو عام عورتیں پہنتی ہیں۔ مرد کو موٹا جھوٹا اور جہاں تک ہو سکے، سفید لباس پہننا چاہیے، جب کہ عورت کے لیے ریشمی اور رنگ دار کپڑے پہننا جائز ہیں۔ پابندی تو بس یہ ہے کہ لباس اتنا باریک نہ ہو، جس میں سے جسم نظر آئے۔ اسی طرح زیور پہننا بھی جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«حُرِّمَ لِبَاسُ الْحَرِيرِ وَالذَّهَبِ عَلَى ذُكُورِ أُمَّتِي وَأُحِلَّ لِإِنَاثِهِمْ»

''ریشم کا لباس اور سونا میری اُمت کے مردوں کے لیے حرام اور عورتوں کے لیے

حلال کیا گیا ہے۔"①

عورت کے لیے ریشم اور سونے کا استعمال جائز ہے، لازم نہیں۔ خاوند کی مالی حالت کے مطابق ہی عورت کا لباس اور زیور ہونا چاہیے۔ خاوند کو چاہیے کہ بیوی کے ساتھ تمام معاشرتی معاملات میں عدل اور مساوات کا اصول جاری رکھے۔ بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ پہننے کے اچھے بھلے کپڑے اور زیورات موجود ہوتے ہیں، اس کے باوجود بھی کپڑے بنوائے چلی جاتی ہیں، زیورات بنواتی رہتی ہیں۔ صندوقوں میں کپڑوں کا ڈھیر جمع ہوتا رہتا ہے اور بکسوں میں زیورات کی تعداد بڑھتی رہتی ہے۔ شوہر سے کپڑے اور زیورات بنوانے پر فرمائشیں کی جاتی ہیں، عزیز رشتے داروں کے ہاں شادی آ جائے تو نئے سرے سے جوڑے تیار کرائے جاتے ہیں، زیور تک نئے بنوائے جاتے ہیں، لہٰذا اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ شوہر کے گھر کے جوڑے جب تک موجود ہیں، اس وقت تک شوہر کے ذمے نیا جوڑا بنوانا واجب نہیں ہے۔ زیورات کے معاملے میں تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جو زیور موجود ہے، بس کافی ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی جوڑے بنوا کر دینا خاوند پر واجب نہیں ہے۔ یوں وہ بنوا دے تو یہ اس کا احسان ہے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ عورت کی ملکیت میں جو زیور ہے، اس زیور کی زکاۃ شوہر پر واجب نہیں، تاہم شوہر کو چاہیے کہ ایسے موقعوں پر کچھ رقم بیوی کو دے دیا کرے تاکہ اسے آسانی ہو جائے، ورنہ شوہر پر واجب نہیں۔ شوہر رقم نہ دے سکے تو عورت کو چاہیے کہ اپنا کچھ زیور بیچ کر اس کی زکاۃ ادا کرے۔ خاوند کے مال سے اس کی رضا مندی کے بغیر ان عبادتوں میں اس کا مال خرچ کرنا ناجائز ہوگا۔ عورتیں اس میں بہت بے احتیاطی کرتی ہیں اور

---

① جامع الترمذي، اللباس، باب ماجاء في الحرير والذهب للرجال، حديث: 1720، ومسند أحمد: 393/4

اس کے ناجائز ہونے کا انھیں خیال تک نہیں آتا۔

زکاۃ کے علاوہ بھی یہی مسئلہ ہے۔ عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر کسی سائل کو یا کسی مدرسے کو چندہ وغیرہ نہیں دے سکتی۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تُنْفِقُ امْرَأَةٌ شَيْئًا مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا إِلَّا بِإِذْنِ زَوْجِهَا، قِيلَ: يَارَسُولَ اللهِ وَلَا الطَّعَامُ؟ قَالَ: «ذَاكَ أَفْضَلُ أَمْوَالِنَا»

''کوئی عورت اپنے خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر کوئی چیز خرچ نہ کرے یعنی صدقہ خیرات میں نہ دے۔ آپ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! کھانا بھی نہ دے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو ہمارا سب سے بہتر مال ہے۔''[1]

اسی طرح شوہر کی مرضی کے بغیر عورت کو کچھ خریدنا بھی جائز نہیں۔ عورتوں کی عادت ہے، بلا وجہ، اندھا دھند چیزیں خریدتی جاتی ہیں اور ذخیرہ کرتی رہتی ہیں۔

میاں بیوی کے حقوق

میاں بیوی کے حقوق کیا ہیں؟ آیئے جائزہ لیتے ہیں۔ پہلے ہم ذکر کرتے ہیں عورتوں کے حقوق جن کی ادائیگی مردوں کے ذمے فرض ہے۔

❁ نکاح کے بعد مرد پر پہلا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کا حق مہر ادا کرے اور اسے خوش دلی سے ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ النساء میں فرماتا ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ﴾

''اور عورتوں کو ان کے حق مہر راضی خوشی دو۔''[2]

---

[1] جامع الترمذی، الزکاۃ، باب ماجاء فی نفقة المرأة من بیت زوجها، حدیث:670

[2] النساء 4:4

ہاں، عورت خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ معاف کر دے، تو جائز ہے۔ اسے ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا جائے، نہ ایسا طریقہ ہی اختیار کیا جائے کہ وہ مہر معاف کرنے میں عافیت سمجھے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيٓـًٔا مَّرِيٓـًٔا ۝﴾

''اگر وہ اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔''[1]

مہر سے دست برداری اس صورت میں قبول ہوگی کہ عورت برضا و رغبت ایسا کرے۔ مہر کتنا ہو؟ شرعاً اس کی کوئی حد نہیں۔ جیسے بعض لوگوں نے 32 روپے مہر کو شرعی مہر کا نام دے رکھا ہے، یہ بالکل بے اصل بات ہے۔ حق مہر طاقت کے مطابق ہونا چاہیے۔ تاہم محض نمود و نمائش کے لیے مہر میں غلو کرنے کو بھی نبی کریم ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«خَيْرُ النِّكَاحِ أَيْسَرُهُ»

''(حق مہر کے اعتبار سے) بہترین نکاح وہ ہے جو آسان ہو۔''[2]

ابو عَجفاء سُلَمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: لوگو! عورتوں کا حق مہر زیادہ مقرر نہ کرو، اگر زیادہ مہر دینا، دنیا میں عزت کا باعث ہوتا، یا اللہ کے ہاں تقوے کا موجب ہوتا، تو نبی کریم ﷺ ایسا کرنے کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنی بیویوں کو بارہ اوقیوں سے زیادہ مہر دیا، نہ اپنی بیٹیوں ہی کا بارہ اوقیوں سے زیادہ

---

[1] النساء 4:4

[2] سنن أبي داود، النكاح، باب فيمن تزوج ولم يسم لها صداقًا حتى مات، حديث:2117

مہر مقرر کیا۔''①

بارہ اوقیوں کا وزن 1 کلو468 گرام (چاندی) بنتا ہے۔

✿ دوسرا حق نفقہ ہے۔ اسلام نے کاموں کی تقسیم کرتے وقت گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش عورت کے ذمے لگائی ہے اور یہ کام ہر وقت مصروفیت کے ہیں، اس لیے انھیں حکم دیا گیا ہے:

﴿ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ ﴾

''اور تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔''②

مرد جسمانی اعتبار سے کارزارِ حیات میں بھرپور حصہ لے سکتا ہے، لہٰذا اسلام نے اہل وعیال کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا، مرد کی ذمے داری بتلائی ہے۔ خاوند اپنی بیوی کو خرچ دینے کی سکت نہ رکھتا ہو، یا سکت تو رکھتا ہو، لیکن دینے سے انکاری ہو، تو اس صورت میں عورت کے مطالبے پر نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے، مرد پر نفقہ کی ادائیگی سورۃ النساء کی اس آیت سے ثابت ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط ﴾

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔''③

یہاں سوال یہ ہے کہ نفقے کا معیار اور حد کیا ہے؟ اس کا جواب بھی سورۃ الطلاق میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

① سنن أبي داود، النكاح، باب الصداق، حديث: 2106

② الأحزاب 33:33 ③ النساء 34:4

﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ﴾

''خوش حال آدمی اپنی خوش حالی کے مطابق نفقہ دے اور جسے رزق کم دیا گیا ہو، وہ اس مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔''①

اس طرح نفقے کی ادائیگی کا فطری معیار قائم کیا گیا، یعنی خاوند کی مالی حالت کے مطابق ہی نفقہ ہوگا۔

❁ خاوند کا تیسرا فرض یہ ہے کہ وہ بیوی پر ظلم اور زیادتی نہ کرے۔ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کرے۔ ظلم کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ البقرہ میں فرماتا ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَاۗءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○﴾

''جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں، ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر وہ طلاق کا عزم کر لیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''②

اس سے ظاہر ہوا کہ قطع تعلق (ایلاء) کی زیادہ سے زیادہ مدت چار ماہ ہے، ورنہ اس مدت کے بعد بیوی کو طلاق دینی ہوگی یا اس کے پاس جانا ہوگا۔ اس آیت کی تفسیر ''احسن البیان'' میں حسب ذیل کی گئی ہے:

ایلاء کے معنی قسم کھانے کے ہیں، یعنی کوئی شوہر اگر قسم کھا لے کہ اپنی بیوی سے ایک مہینہ یا دو مہینے تعلق نہیں رکھوں گا، پھر قسم کی مدت پوری کر کے تعلق قائم کر لیتا ہے تو کوئی کفارہ نہیں، ہاں اگر مدت پوری ہونے سے قبل تعلق قائم کرے گا تو کفارۂ قسم ادا کرنا ہوگا۔ اور اگر چار مہینے

① الطلاق 7:25 ② البقرة 2:226، 227

سے زیادہ مدت کے لیے یا مدت کے تعین کے بغیر قسم کھاتا ہے تو اس آیت میں ایسے لوگوں کے لیے مدت کا تعین کر دیا گیا ہے کہ وہ چار مہینے گزرنے کے بعد یا تو بیوی سے تعلق قائم کر لیں، یا پھر اسے طلاق دے دیں۔ (اسے چار مہینے سے زیادہ معلق رکھنے کی اجازت نہیں ہے) پہلی صورت میں اسے کفارۂ قسم ادا کرنا ہوگا۔ اگر دونوں میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کرے گا تو عدالت اس کو دونوں میں سے کسی ایک بات کو اختیار کرنے پر مجبور کرے گی کہ وہ اس سے تعلق قائم کرے، یا طلاق دے تاکہ عورت پر ظلم نہ ہو۔

دوسرا ظلم ہے انھیں ستانے کے لیے روکے رکھنا۔ اس طرح خاوند، بیوی کو جو جسمانی اور روحانی تکالیف پہنچائے گا، اسے ضِرار و تعدّی (تکلیف پہنچانا اور زیادتی کرنا) کہتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ﴾

''اور انھیں ستانے اور زیادتی کرنے کے لیے نہ روک رکھو، جو ایسا کرے گا، وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو مذاق نہ بناؤ۔''[1]

اللہ کے اس حکم کی رُو سے جو خاوند اپنی بیوی سے اس قسم کا سلوک کرے گا تو بیوی کو حق ہوگا کہ قانون کی مدد سے خاوند سے گلو خلاصی حاصل کر لے۔

ظلم کی تیسری قسم ہے، ایک سے زائد بیویاں ہونے کی صورت میں عدل نہ کرنا۔

ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی اجازت ہے ہی اس صورت میں کہ ان کے درمیان عدل کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾

---

[1] البقرة 231:2

''پھر اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے، تو ایک ہی (پر قناعت کرو۔)''①

مرد اگر ایک سے زائد بیویاں رکھتا ہے، تو اسے اس اصول کی پابندی کرنی ہوگی کہ تمام بیویوں سے امکان کی حد تک ہر معاملے میں عدل کرے، کسی ایک کا ہو کر نہ رہے۔ اس عہد کی خلاف ورزی ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ النساء میں فرماتا ہے:

﴿فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ﴾

''کسی ایک کی طرف بالکل نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو گویا معلق چھوڑ دو۔''②

ایسی عورت جسے خاوند نے اللہ کے حکم کے خلاف چھوڑ رکھا ہو، قانون کے ذریعے سے دادرسی حاصل کر سکتی ہے اور طلاق لے سکتی ہے۔

یہ ظلم کی وہ صورتیں ہیں جن میں قانون مداخلت کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسے معاملات ہیں جو رحمت اور شفقت کے خلاف ہیں۔ قرآنِ کریم اور احادیث میں ایسے حالات میں زوجین کو اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں۔

عورت کے ذمے شوہر کے حقوق

سب سے پہلا نمبر ہے اطاعت کا۔ اطاعت اللہ تعالیٰ کا حق ہے، یعنی مخلوق کو چاہیے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، جیسا کہ ایک ملک کے حاکم کا حق ہوتا ہے کہ اس ملک میں بسنے والے لوگ اس کے قوانین پر عمل کریں۔ ملک میں چھوٹی سے چھوٹی اکائی گھر ہے، وہاں بیوی اور اولاد کا فرض ہے کہ صاحبِ خانہ کا حکم مانیں۔ فرش سے لے کر عرش تک تمام ادارے ایک ہی جذبے کے تحت مصروفِ عمل ہیں اور وہ جذبہ ہے اطاعت کا۔ یہ جذبہ نہ ہو تو نظم و نسق قائم نہیں رہ سکتا۔ مختلف اور متضاد احکام حالات کو زیر و زبر کر کے رکھ دیں گے اور سارا نظام درہم

---

① النساء 3:4 ② النساء 129:4

برہم ہو جائے گا۔

شوہر کا اپنی بیوی پر پہلا حق یہ ہے کہ بیوی اس کا ہر حکم بجا لائے، شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی حکم اللہ تعالیٰ کے حکم سے نہ ٹکراتا ہو، لہٰذا ایک اچھی بیوی کی خصوصیت شوہر کی اطاعت ہے۔ اس کی تائید متعدد احادیث سے ہوتی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اے اللہ کے رسول! کون سی عورت سب سے زیادہ اچھی ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«خَيْرُ النِّسَاءِ الَّتِي تَسُرُّهُ إِذَا نَظَرَ، وَتُطِيعُهُ إِذَا أَمَرَ، وَلاَ تُخَالِفُهُ فِي نَفْسِهَا وَلاَ مَالِهَا بِمَا يَكْرَهُ»

''سب سے اچھی عورت وہ ہے کہ جس وقت اس کا شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کر دے، جب اسے حکم دے تو بجا لائے، اپنی ذات اور مال کے بارے میں خاوند کو ناگوار گزرنے والی بات نہ کرے۔''[1]

اسی سلسلے کی بہت اہم حدیث سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ثَلاَثَةٌ لاَ تُجَاوِزُ صَلاَتُهُمْ آذَانَهُمْ: الْعَبْدُ الآبِقُ حَتَّى يَرْجِعَ، وَامْرَأَةٌ بَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَلَيْهَا سَاخِطٌ، وَإِمَامُ قَوْمٍ وَهُمْ لَهُ كَارِهُونَ»

''تین آدمی ایسے ہیں کہ ان کی نماز ان کے کانوں سے تجاوز نہیں کرتی: بھاگا ہوا غلام یہاں تک کہ واپس آ جائے، اور (دوسری) وہ عورت جو اس حال میں رات گزارتی

[1] مسندأحمد، حدیث: 251/2 وصححه الألبانی فی سلسلة الأحادیث الصحیحة، حدیث: 1838

ہے کہ اس کا خاوند اس سے ناراض ہے اور (تیسرا) وہ آدمی جو کسی قوم کا امام ہے اور وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔''[1]

اس حدیث میں شوہر کی ناراضی کا سبب، بیوی کا گھریلو کام کاج میں دلچسپی نہ لینا اور سستی اور کاہلی سے کام لینا معلوم ہوتا ہے، لہٰذا بیوی کو چاہیے کہ وہ گھر کے نظم ونسق میں خاطر خواہ دلچسپی لے۔ زندگی میں غم اور خوشی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اگر خاوند کی آمدنی تھوڑی ہو تو زندگی کچھ تنگی سے گزرتی ہے، لیکن عورت کے تعاون سے گزر اوقات ہو ہی جاتی ہے اور حقیقی لذت اور راحت اسی ایثار وقربانی اور باہم تعاون کرنے ہی میں ہے۔ مسلمان بیوی کو صابر وشاکر بن کر ان حالات کا مقابلہ صبر شکر ہی سے کرنا چاہیے اور خاوند کو اپنی تکلیف یا پریشانی کا احساس نہیں ہونے دینا چاہیے یا اس حد تک احساس نہ دلائے کہ وہ پریشان رہنے لگے۔ عورت کو تکلیف اور دکھ کے موقع پر کس طرح صبر وشکر کا مظاہرہ کرنا چاہیے، صحیح بخاری کی اس حدیث سے بخوبی واضح ہے، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک لڑکا بیمار تھا، ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے کہ بچے کا انتقال ہو گیا، جب وہ تھکے ماندے گھر آئے تو پوچھا: بچے کا کیا حال ہے؟ ان کی بیوی ام سُلَیم رضی اللہ عنہا نے کہا کہ وہ پہلے سے زیادہ سکون میں ہے۔ پھر ان کی بیوی نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے وہ کھانا کھایا۔ پھر انھوں نے اپنی بیوی کے ساتھ خلوت اختیار کی۔ صبح انھوں نے غسل کیا اور باہر جانے لگے تو ان کی بیوی ام سلیم رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ ان کا بیٹا فوت ہو چکا ہے۔

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر سارے واقعے سے آگاہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کیا تم نے رات کو اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کیے تھے؟'' انھوں نے عرض کیا: جی ہاں! چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: ''اے اللہ! ان

[1] جامع الترمذی، الصلاۃ، باب ماجاء فی کراھیۃ أن یخص الإمام نفسہ بالدعاء، حدیث: 360

دونوں کے ہاں برکت عطا فرما!'' انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا تو مجھے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اسے حفاظت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤ۔ میں وہ بچہ آپ کی خدمت میں لایا اور ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کچھ کھجوریں آپ کی خدمت میں بھیجیں۔ آپ نے اس بچے کو پکڑا اور دریافت کیا کہ ''اس کے ساتھ کوئی اور چیز بھی ہے؟'' لوگوں نے کہا، جی ہاں! کھجوریں ہیں۔ آپ نے ایک کھجور کو چبایا اور اس کے ساتھ بچے کو گھٹی دی اور اس کا نام عبداللہ رکھا۔ [1]

اس حدیث میں عورت کے لیے یہ درس ہے کہ صبر کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑے اور بڑی سے بڑی مصیبت پر صبر کرے، جیسا کہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کمال استقلال کا مظاہرہ کیا اور رنج و غم کو ایسا چھپایا کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سمجھے کہ بچہ واقعی اچھا ہو گیا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا عظیم ثمرہ عطا کیا۔ حقیقت ہے کہ صبر کے بہت فوائد ہیں، اگر صحیح معنوں میں صبر کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ»

''اور کسی شخص کو ایسا عطیہ نہیں دیا گیا، جو صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع ہو۔'' [2]

بیوی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے گھر میں ایسے شخص کو آنے دے، جس کا آنا شوہر کو ناپسند ہو یا ایسی جگہ جائے، جہاں اس کا جانا شوہر کو ناگوار ہو۔

شوہر کا ایک حق یہ ہے کہ اس کی بیوی، اس کے گھر اور مال و اسباب کی نگہداشت کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

---

[1] صحيح البخاري، الجنائز، باب من لم يظهر حزنه عند المصيبة، حديث: 1301 و العقيقة، باب تسمية المولود غداة يولد......، حديث: 5470

[2] صحيح البخاري، الزكاة، باب الاستعفاف عن المسئلة، حديث: 1469

«إِنْ غَابَ عَنْهَا نَصَحَتْهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهِ»

''شوہر کہیں باہر جائے تو اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی، اپنی عزت و آبرو اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا»

''اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔''[2]

لہٰذا بیوی کا فرض ہے کہ وہ شوہر کے گھر کی، جو دراصل اس کا اپنا گھر ہے، حفاظت کرے اور اس کے ساز و سامان اور دولت کو بھی حفاظت سے رکھے۔ فضول اور بے موقع خرچ یا استعمال نہ کرے۔

بعض بے عقل بیویاں اپنے میکے والوں کو شوہر کی دولت سے فائدہ پہنچانا شروع کر دیتی ہیں۔ اگر وہ خاوند کی مرضی کے بغیر ایسا کرتی ہیں تو خیانت کرتی ہیں اور اگر خاوند کی مرضی سے کرتی ہیں، تب بھی یہ ان کی فضول خرچی ہے لیکن اگر بیوی کے والدین غریب ہوں تو وہ شوہر کی مرضی سے انھیں فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا' اور پھر اس کو اللہ کے لیے کسی عزیز پر خرچ کرنا دہرے ثواب کا موجب ہے۔

گھر کی نگہبانی میں یہ امر بھی شامل ہے کہ بیوی امورِ خانہ داری میں دلچسپی لے۔ اس سلسلے میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی سے مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے ہاتھوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے دھوتی تھیں اور سر

---

[1] سنن ابن ماجه، النكاح، باب أفضل النساء، حديث: 1857

[2] صحيح البخاري، الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن، حديث: 893

مبارک پر تیل لگاتی تھیں۔ گھر کا تمام کام کاج خود کرتی تھیں۔ اسی طرح سیدنا حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہماری والدہ ماجدہ گھر کا تمام اندرونی کام کاج مثلاً کھانا پکانا، چکی پیسنا، کپڑے دھونا، گھر میں جھاڑو وغیرہ، خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھیں اور انھی کاموں کے دوران میں ہماری ضرورتیں مثلاً نہلانا، کپڑے بدلوانا وغیرہ، ہر کام وقت پر پورا کرتی تھیں۔

دوسرے نمبر پر تربیتِ اولاد آتی ہے، شوہر کا یہ بھی حق ہے کہ اولاد کی مناسب تربیت کرے۔ اس بارے میں ہم حقوق الوالدین اور حقوق الاولاد میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

بیوی کو یہ بھی چاہیے کہ اپنے مطالبات کا جائزہ لے۔ اس کو صرف حلال اور جائز حد تک ہی رہنے دے، آگے نہ بڑھائے۔ ہمارے اسلاف میں ایسی نیک دل خواتین کا پتا چلتا ہے جو اس پر سختی سے کاربند تھیں۔ اُن کے شوہر یا والد جب کاروباری غرض سے سفر پر روانہ ہوتے تو یہ ان سے ان الفاظ میں درخواست کرتی تھیں:

آپ حرام روزی سے کسی طرح بھی اپنا دامن آلودہ نہ کریں، کیونکہ ہمارے لیے یہ تو ممکن ہے کہ قدرے بھوک اور تکلیف پر صبر کر لیں، مگر آگ کو برداشت کرنا ناممکن ہے۔

مطلب یہ کہ ہماری اُن ماؤں کو اسلامی قدروں کا اس قدر خیال تھا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر خواتین خاص طور پر اپنی بچیوں کو سننے اور اطاعت کرنے کی تلقین کیا کرتی تھیں، چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ سیدہ اسماء بنت خارجہ فزاری رضی اللہ عنہا نے اپنی بیٹی کو سسرال بھیجتے وقت جو وصیت کی تھی، وہ یہ ہے:

بیٹی! تم ایک جانے بوجھے آشیانے سے نکلی ہو اور ایسے مکان کو اپنا رہی ہو جسے تم نہیں پہچانتیں، اور ایسے رفیقِ حیات سے تمھارا سامنا ہے، جس سے تم ناآشنا ہو مانوس نہیں، لہٰذا تمھیں چاہیے کہ زمین کی طرح اس کے پاؤں تلے بچھ جاؤ۔ وہ تمھارے حق میں آسمان بننے کی کوشش کرے گا۔ تم خود کو فرش کی طرح ثابت کرو، وہ تمھارے لیے ستون ثابت ہوگا۔ تم لونڈی

بن کر رہو، وہ غلامِ بے دام بن کر رہے گا۔ کسی مطالبے پر اصرار نہ کرو، ورنہ بے زار ہو جائے گا۔ اس سے دُور دُور نہ رہو ورنہ بھلا دے گا۔ اگر وہ قریب آئے تو تم بھی قریب آنے کی کوشش کرو، اگر وہ دور رہے تب بھی تم نزدیک جانے کی کوشش کرو۔ ہر حال میں اس کی عزت، شہرت اور شخصیت کا خیال رکھو۔ وہ تم سے سوائے مہک کے اور کچھ نہ سونگھنے پائے اور سوائے اچھی بات کے کچھ نہ سننے پائے۔

آپ غور کریں کہ انھوں نے بیٹی کو کس قدر بہترین نصیحتیں کیں۔ مطلب یہ کہ مطالبات میں اعتدال سے کام لینا چاہیے' مطالبات محدود ہوں گے تو شوہر کی تگ و دو کم ہوگی اور اسے بھی دو چار گھڑیاں آرام کی میسر آ جائیں گی۔ مطالبات اور خواہشات کا سلسلہ آگے ہی آگے بڑھاتے نہیں رہنا چاہیے۔ خاوند کی قوتِ خرید سے بڑھ کر قیمتی لباس کا مطالبہ بھی نہیں کرنا چاہیے، ورنہ ہوسکتا ہے کہ خاوند اس کے مطالبات پورے کرنے کے لیے نا جائز ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے، جرائم کے راستے پر چل نکلے، رشوت لینے لگ جائے۔

ہمارے ملک کے قریباً ہر طبقے کے لوگوں کی بیویوں نے بدقسمتی سے اپنے حقوق و فرائض پورے ادا نہیں کیے۔ چاہیے تو انھیں یہ تھا کہ اپنے شوہروں کی جائز آمدنی کے اندر رہ کر گزارا کرتیں، چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتیں۔ کار، کوٹھی، بینک بیلنس اور بانڈز کے چکر میں نہ پڑتیں کہ یہ چیزیں زندگی میں آسائش کے سامان تو ہیں، مگر سکون دینے کے قابل نہیں، اور سکون ہی اصل دولت ہے۔ مال و دولت کی کوئی حیثیت ہوتی تو پیغمبروں اور ولیوں کو اس سے دور نہ رکھا جاتا۔

مسلمان بیوی خوش قسمت ہے کہ اس کے سامنے سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن جیسی بے مثال خواتین کی مثالیں موجود ہیں، یہ نہ صرف مثالی خواتین تھیں بلکہ مثالی بیویاں بھی تھیں۔

اسی طرح خاوندوں کے لیے نبیٔ اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیاں بہترین نمونہ ہیں۔ نبیٔ کریم ﷺ کے اخلاق اپنی بیویوں کے ساتھ بڑے خوشگوار تھے۔ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ لگائی۔ اس وقت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا دبلے پتلے جسم کی تھیں، ہلکی پھلکی ہونے کے سبب نبیٔ کریم ﷺ سے آگے نکل گئیں۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے ان سے پھر دوڑ لگائی، اس وقت ان کا جسم قدرے فربہ ہو چکا تھا، لہٰذا دوڑ میں پیچھے رہ گئیں۔ آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: اے عائشہ! ''یہ پہلی بار کا بدلہ ہے''، یعنی پہلے تم آگے نکل گئی تھیں۔ آج میں نے آگے نکل کر اس دن کا بدلہ لے لیا۔[1]

آپ ذرا غور کریں، نبیٔ کریم ﷺ نے یہ دوڑ بلا وجہ نہیں لگائی۔ آپ نے اس سے اپنی اُمت کو یہ تعلیم دی کہ اگر زیادہ عمر والا، کم عمر والی سے شادی کرے، تو اس کی کم سنی کا خیال رکھنا چاہیے اور اسی مناسبت سے اس کے جذبات کی رعایت رکھے۔ کیونکہ بچوں کی طبیعت کھیل کود کو پسند کرتی ہے، لہٰذا انھیں اس کا موقع دینا چاہیے اور عملی طور پر اجازت دی جائے جیسا کہ نبیٔ کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خود دوڑ لگائی۔ ایک بار آپ نے انھیں حبشیوں کا کھیل دکھایا۔ وہ مسجد کے احاطے میں نیزوں سے کھیل رہے تھے۔ آپ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو گڑیوں سے کھیلنے کی بھی اجازت دی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ محلے کی لڑکیاں نبیٔ کریم ﷺ کے گھر آ جاتیں اور سیدہ عائشہ کے ساتھ کھیلنے لگ جاتیں۔ ایسے میں اگر آپ ﷺ تشریف لے آتے تو انھیں کچھ نہ کہتے، بلکہ فرماتے: اطمینان سے کھیلو۔ ان سب باتوں میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر زیادہ عمر والے شخص کی کم عمر والی خاتون سے شادی ہو جائے، تو اس کے ساتھ معاشرت کیسے کی جائے گی، چنانچہ آپ نے امت کو حُسنِ معاشرت کی تعلیم دی۔

---

[1] مسند أحمد: 264/6

نبی اکرم ﷺ بیویوں کے حقوق میں مکمل مساوات اور عدل قائم رکھتے تھے۔ کسی قسم کا کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے۔ رہا معاملہ محبت کا، تو اس بارے میں نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''اے اللہ! جس کا مجھے اختیار تھا اس کی تقسیم تو میں نے مساویانہ کر دی، لیکن جو بات میرے بس میں نہیں، اس پر مجھے ملامت نہ کرنا۔''[1] آپ کے ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ معاملات اور معاشرت اختیاری چیزیں ہیں اور محبت اور طبیعت کا میلان اختیاری نہیں ہے۔

نبی ﷺ کے ازدواجی تعلقات حسنِ معاشرت اور حسنِ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ آپ ﷺ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے زانو سے ٹیک لگا لیتے تھے اور اسی حالت میں قرآنِ کریم کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ ایامِ ماہواری سے ہوتیں لیکن آپ ان کی طرف التفات فرماتے۔ یہ سب باتیں آپ کے ازواجِ مطہرات کے ساتھ حسنِ سلوک اور لطف و کرم کا نتیجہ تھیں۔ جب آپ سفر کا ارادہ کرتے تو ازواجِ مطہرات کے درمیان قرعہ ڈالتے۔ جن کا نام نکل آتا، وہی ساتھ جاتیں۔ جامع ترمذی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے:

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي»

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے لیے سب سے بہتر ہے اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر (سلوک کرنے والا) ہوں۔''[2]

آپ تمام ازواجِ مطہرات کے گھروں میں تشریف لے جاتے۔ ان کے پاس بیٹھتے، ان کے حالات معلوم کرتے، جب رات ہو جاتی تو وہاں تشریف لے جاتے جہاں باری ہوتی۔ رات وہیں بسر کرتے۔ آپ باری کی اتنی پابندی فرماتے کہ کبھی کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ آپ ازواج مطہرات کے یہاں تشریف نہ لے گئے ہوں۔

---

① سنن أبي داود، النكاح، باب في القسم بين النساء، حديث:2134، وسنن النسائي، عشرة النساء، باب ميل الرجل إلى بعض نسائه دون بعض، حديث:3395

② جامع الترمذي، المناقب، باب فضل أزواج النبي ﷺ، حديث:3895

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا:

میرے بھانجے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم میں ازواجِ مطہرات کو ایک دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے تھے، یعنی ہمارے پاس وقت گزارنے میں۔ اور بہت کم ایسا ہوتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف نہ لائیں اور ہمارے قریب ہو کر نہ بیٹھیں، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بیوی کے پاس پہنچتے، جس کی اس دن باری ہوتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ازدواجی تعلقات قائم کرتے۔ جب سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کمزور ہوگئیں اور ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو چھوڑ نہ دیں، تو انھوں نے اپنی باری عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو منظور کر لیا۔[1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کوئی عورت کسی عذر کی وجہ سے اپنی باری اپنی سوتن کو ہبہ کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، لیکن اس کے لیے خاوند کی رضامندی ضروری ہے، کیونکہ خاوند کا جس طرح دوسری بیوی پر حق ہے اسی طرح اس ہبہ کرنے والی بیوی پر بھی حق ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پیالے کو جس جگہ منہ لگاتیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سے پیالہ لے کر وہیں لب مبارک لگا کر پانی پیتے تھے۔ جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہڈی پر سے گوشت کھاتیں تو آپ گوشت والی وہ ہڈی لے کر وہاں منہ لگاتے جہاں سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کھایا تھا۔ آپ بیویوں کا پاک صاف رہنا پسند فرماتے۔ آپ ان سے نرم لہجے میں گفتگو کرتے، کوئی بات ناگوار گزرتی، تو صرف اتنا کرتے کہ التفات میں کمی کر دیتے۔ آپ گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے داخل ہوتے۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر بیمار ہوئے، تو آپ نے اپنی بیویوں سے اس بات کی اجازت چاہی کہ وہ آپ کو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے

---

[1] سنن أبي داود، النكاح، باب في القسم بين النساء، حديث: 2135

گھر رہنے دیں۔ سب نے خوشی سے اجازت دے دی۔ نبیٔ کریم ﷺ کے ایسا کرنے سے یہ باتیں بخوبی سمجھ میں آتی ہیں کہ آپ اپنی بیویوں کے درمیان اس قدر انصاف فرماتے تھے۔ دوسرا یہ کہ شوہر ایک بیوی کی باری والے دن دوسری بیوی کے ہاں جانا چاہے تو اس کی اجازت حاصل کرے۔ تیسرا یہ کہ بیوی بھی ان حالات میں شوہر کی رعایت کرے۔

نبیٔ اکرم ﷺ نے شوہروں کو بیویوں کے حقوق کے معاملے میں جو نصیحت فرمائی ہے، وہ نصیحت کتب احادیث میں اس طرح آئی ہے:

''عورتوں سے اچھا برتاؤ کرو، کیونکہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہے، لہٰذا اگر تم اسے بالکل سیدھا کرنا چاہو گے، تو اسے توڑ بیٹھو گے اور اس کا توڑنا طلاق دینا ہے اور اگر اسے اس کے حال پر رہنے دو گے، تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی، اس لیے میں تمہیں ان کے حق میں اچھے برتاؤ کی نصیحت کرتا ہوں۔ اس نصیحت کو قبول کرو۔''[1]

اسی طرح شوہر کو چاہیے کہ بیوی کو پردے کی تلقین کرے اور سختی کے ساتھ اس پر عمل بھی کرائے، کیوں کہ بے پردگی بہت سی برائیوں کا پیش خیمہ ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے اس کا حکم دیا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾

''اے نبی! اپنی بیویوں سے، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں۔''[2]

---

① صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب خلق آدم و ذريته، حديث: 3331، وصحيح مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء، حديث: 1470

② الأحزاب 59:33

امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے جس قدر اہتمام کے ساتھ پردہ کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔
جنگِ جمل کا مشہور واقعہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھائی ان کے پاس اس وقت آئے جب کہ جنگ کا نقارہ بج چکا تھا اور میدانِ کارزار گرم تھا۔ ان کے بھائی کے ہاتھ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک رقعہ تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی ان کی اونٹنی کے قریب ہو کر وہ رقعہ ان کو پیش کرنے لگے۔ اس وقت عائشہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر نقاب تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے بھائی کو پہچان نہ سکیں اور افسوس کے انداز میں بولیں: آج عام لوگ میرے پاس بغیر اجازت آنے کی جرأت کرنے لگ گئے ہیں۔ ان کے بھائی نے جواب دیا: نقاب اُٹھا کر دیکھو میں کون ہوں؟ غیر ہوں یا اپنا![1]

اس واقعہ سے آپ اندازہ لگائیں کہ امہات المومنین پردے کے معاملے میں کس قدر سخت تھیں، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جنگ کے نازک موقع پر بھی پردے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور پردے کی وجہ سے وہ اپنے سگے بھائی کو بھی نہ پہچان سکیں۔ عورتوں کو چاہیے کہ ان مثالی عورتوں کے کردار پر عمل کریں اور پردے کا اہتمام کریں۔ شوہر کے حق کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لأَحَدٍ، لأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا»

”اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ کسی کو سجدہ کرے، تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔“[2]

سیدنا ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

① ”ایمان وعمل“ از مولانا عبدالروف جھنڈانگری، ص: 476

② جامع الترمذی، الرضاع، باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأة، حدیث: 1159

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لاَ تُؤَدِّي الْمَرْأَةُ حَقَّ رَبِّهَا حَتَّى تُؤَدِّيَ حَقَّ زَوْجِهَا»

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! کوئی عورت اس وقت تک اپنے رب کا حق ادا نہیں کرسکتی جب تک اپنے شوہر کا حق ادا نہ کرلے۔''[1]

یعنی عورت اگر صرف نماز روزے کا اہتمام کرتی رہے گی اور اپنے شوہر کے حقوق ادا نہیں کرے گی، تو اس کی نجات نہیں ہوگی۔

① سنن ابن ماجه، النكاح، باب حق الزوج على المرأة، حديث: 1853

ازدواجی زندگی کو پُرمسرت اور خوشگوار بنانے کے لیے چند نصیحتیں

- میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کی خوبیوں کو ہر وقت سامنے رکھیں اور خامیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کریں، کیونکہ کچھ نہ کچھ خامی ہر انسان میں ہوتی ہے، اسی طرح کچھ نہ کچھ خوبیاں بھی ہر ایک میں ہوتی ہیں۔ اگر نظر خوبیوں پر رہے تو خامیوں کو نظر انداز کرنا آسان ہو جاتا ہے۔
- خود بینی اور خود پرستی سے احتراز کریں، اس کے برعکس دوسرے کی خوبیوں کی تعریف کریں اور انھیں سراہیں۔
- دونوں بیک وقت غصے کا مظاہرہ نہ کریں۔ ایک فریق ہر صورت میں تحمل اور برداشت سے کام لے۔ مرد کو خاص طور پر زیادہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور صنفِ نازک کو صنفِ نازک ہی سمجھے، اسے اپنی شفقت، پیار اور محبت کا مستحق ہی سمجھے، اسے اپنا حریف اور مقابل ہرگز نہ سمجھے۔
- تخلیہ ہو یا مجلس، ایک دوسرے کے خلاف جلی کٹی نہ کہیں۔
- ایک دوسرے سے تیز گفتاری اور سختی سے پیش نہ آئیں بلکہ نرم گفتاری اور نرمی کو معمول بنائیں۔
- ایک دوسرے کی بات ماننے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔

- ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کو معمول بنایا جائے۔
- نکتہ چینی یا بدخوئی اور خوردہ گیری سے اجتناب کیا جائے۔ اگر کبھی اس کی ضرورت پیش آ ہی جائے، تو نہایت حکمت اور شیریں الفاظ میں اس کا اظہار کیا جائے۔
- پچھلی غلطیاں دہرائی جائیں، نہ وہ یاد دلائی جائیں، بلکہ ان کو فراموش کر دیا جائے۔
- ہر فریق دوسرے کی جائز خواہش اور فطری جذبات کا احترام کرے، انھیں مجروح نہ کرے۔
- ایک دوسرے کو کبھی نظر انداز نہ کریں، بلکہ زیادہ سے زیادہ اپنائیت کا اظہار کریں۔
- ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں باہمی رازوں اور مشترکہ چیزوں کی حفاظت کریں۔
- ایک دوسرے کو ہر حال میں خندہ پیشانی سے ملیں۔
- بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے کی خدمت کریں۔ دوسرے کو خادم اور اپنے آپ کو مخدوم نہ سمجھیں، بلکہ گھر کا نظام باہمی تعاون سے چلائیں۔
- کوئی ناراضی والی بات ہو جائے، تو اسے بڑھنے نہ دیں بلکہ اولین فرصت میں اسے ختم کر لیا جائے، چنگاری کو شعلہ بنتے دیر نہیں لگتی۔ عقل مندی یہی ہے کہ چنگاری کو شعلہ نہ بننے دیا جائے، ورنہ ہنستا بستا گھر اُجڑ سکتا ہے، ایک خوش نما باغ خزاں میں تبدیل ہو سکتا ہے اور ایک نعمت کدہ جہنم کدہ بن سکتا ہے۔
- مرد بالادست، قوّام اور زیادہ قوت و ہمت والا ہے، اس لیے اسے عورت کے مقابلے میں زیادہ بردباری، صبر اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ وہ عورت کی کمزوری اور فطری کجی کو حکمت اور صبر سے برداشت کرے۔ اسے بالکل سیدھا کرنے کے چکر یا زعم میں نہ پڑے، ورنہ وہ اسے سیدھا کرتے کرتے اپنا گھر اُجاڑ لے گا۔
- گھر میں آنے والے مہمان کا تعلق بیوی کے خاندان سے ہو یا شوہر کے خاندان

سے، بحیثیت مہمان کے اپنی طاقت کے مطابق اس کی مہمان نوازی کی جائے۔ مہمان نوازی میں اپنے خاندان کے فرد کو تو اپنا سمجھا جائے اور دوسرے کو غیر، یہ تفریق بھی باہم بغض وعناد اور دلوں میں کدورت کا باعث بنتی ہے۔اس سے اجتناب کیا جائے۔

- عُسر ہو یا یُسر (تنگ دستی ہو یا خوش حالی) دونوں حالتوں میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور پورے خلوص سے عہد وفا نبھائیں۔
- دونوں اپنی خواہشات اور جذبات کے مقابلے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو فوقیت اور ترجیح دیں۔
- گھر میں اور گھر سے باہر شرعی پابندی کا اہتمام کریں۔
- ساس، آنے والی بہو کو اپنی بیٹی سمجھے، بیٹی کی طرح اس سے پیار کرے اور بیٹی کی طرح ہی اس سے سارا معاملہ کرے۔ بہو، اپنی ساس کو ماں سمجھے، ماں کی طرح اس کا ادب و احترام کرے اور بیٹی بن کر گھر کے کام کاج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔عورت کی عزت کام کاج ہی میں ہے، نہ کہ شہزادی بن کر مسہری پر لیٹے رہنے میں۔
- نندیں (خاوند کی بہنیں) بھی بھابھی کو بہن سمجھیں اور بہنوں کی طرح اس سے معاملہ کریں۔ گھر کے سارے کام باہم مل کر کریں۔ آنے والی دلہن ہی پر سارا بوجھ نہ ڈال دیں۔ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ گھر کا سکون باہم پیار محبت میں ہے، نہ کہ باہم رقابت اور لگائی بجھائی میں۔
- زبان کی حفاظت کریں اور ''پہلے تولیں، پھر بولیں'' کے مقولے کو ہر وقت سامنے رکھیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ تلوار کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں، لیکن زبان کے زخم نہایت خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ پہلے دل کو گھائل کرتے ہیں اور پھر گھر کی بربادی اور اولاد کی تباہی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

- مرد نہایت غصے اور کشیدگی کے عالم میں بھی طلاق کا لفظ کبھی زبان پر نہ لائے۔ اور اسی طرح عورت بھی خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرے، نہ طلاق لینے والا رویہ ہی اختیار کرے۔ دونوں ہر حالت میں عقدِ نکاح کو نبھانے کی کوشش کریں۔
- خاص طور پر صاحبِ اولاد ہونے کی صورت میں کبھی ایک دوسرے سے علیحدگی کا نہ سوچیں۔ علیحدگی کی صورت میں دونوں کا گھر ہی نہیں اُجڑے گا، اولاد کا مستقبل بھی برباد ہو جائے گا۔ ان غنچوں کو بن کھلے ہی نہ مرجھا دیں، بلکہ دونوں مل کر ان کی حفاظت اور تربیت کریں تاکہ وہ ثمر وار درخت بن کر ان کے لیے گھنی چھاؤں کا کام بھی دیں، اور ان کے لیے بڑھاپے میں سہارا بھی بنیں۔

www.KitaboSunnat.com

حقوق الاولاد



اس دنیا میں انسان کا جس سے بھی کوئی رشتہ ناتا ہے، اُس پر اس کے کچھ نہ کچھ حقوق ضرور ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ تو حقوق مانگ کر لے لیتے ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مانگنے کی طاقت نہیں رکھتے، انھیں حقوق خود دینے پڑتے ہیں۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کی پیدائش کے ساتھ ہی اُس کے والدین پر کچھ حقوق عائد ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ خودنہیں مانگ سکتا۔

انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے، اس لیے اُسے بہت سے فرائض سونپے گئے ہیں۔ ان میں اولاد کی تربیت سب سے اہم فریضہ ہے۔ اللہ رب العزت قیامت کے دن اولاد سے والدین کے متعلق سوال کرنے سے پہلے والدین سے اولاد کے متعلق سوال کرے گا۔ کیونکہ جس طرح والدین کا اولاد پر حق ہے، اسی طرح اولاد کا والدین پر حق ہے۔

اولاد کی اچھی تربیت میں کوتاہی کے بہت سنگین نتائج سامنے آتے ہیں۔ شیر خوارگی سے لڑکپن اور جوانی کے مراحل میں اُسے مکمل رہنمائی اور تربیت درکار ہوتی ہے۔ اس تربیت کا آغاز والدین کی

اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ اولاد کے لیے پاک اور حلال غذا کی فراہمی والدین کے ذمے ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب وہ رزقِ حلال کمائیں۔ والدین جھوٹ بولنے کے عادی ہیں تو بچہ بھی جھوٹ بولے گا۔ والدین کی خرابیاں نہ صرف ظاہری طور پر بچے کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ باطنی طور پر بھی یہ خرابیاں اُس کے اندر رچ بس جاتی ہیں۔ والدین کے جسم میں گردش کرنے والے خون میں اگر حرام، جھوٹ، فریب، حسد اور دوسری خرابیوں کے جراثیم موجود ہیں تو یہ جراثیم بچے کو بھی وراثت میں ملیں گے۔ جس خرابی کا بیج آج ہم اپنی ذات میں بو رہے ہیں، بچہ کل اُسی کی فصل کاٹے گا۔

بیشتر والدین کو اس بات کا فہم اور ادراک ہی نہیں کہ بچے کی پرورش اور تربیت کے سلسلے میں اُن پر کیا حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اگر وہ اُن حقوق پر پورا نہیں اُترتے تو انھیں دنیا میں اور آخرت میں کن بھیانک نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کی وجہ لاعلمی بھی ہوسکتی ہے اور دینی تعلیمات سے دوری بھی۔ وجہ جو بھی ہے والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اولاد کی تربیت کے حوالے سے ان کے حقوق کو پہچانیں تاکہ دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل ہو۔ اور وہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں معتوب ہونے سے بچ جائیں۔

''حقوق الاولاد'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس باب میں والدین کے لیے اولاد کے حقوق کے حوالے سے، کتاب وسنت کی روشنی میں مکمل رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔

جس طرح والدین کے اولاد پر حقوق ہیں، اسی طرح اولاد کے کچھ حقوق والدین پر بھی ہیں۔ دوسرے مذاہب نے ماں باپ کے حقوق کی تو نشان دہی کی ہے، لیکن اولاد کے حقوق کے معاملے میں کچھ نہیں کہا۔ اسلام کو چونکہ ہر طبقے کے افراد کی کارکردگی کی اصلاح کرنا اور معاشرے میں اعتدال قائم کرنا تھا، لہٰذا اس میں اولاد کے متعلق بھی والدین کو پابند کیا گیا۔ اور اس کی بنیاد سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا»

"جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی عزت نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔"[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک چھوٹوں اور بڑوں کے آپس کے حقوق کی بنیاد ہے۔ اس تعلیم کے ذریعے سے اسلام نے ماتحت، افسروں، ملازموں، آقاؤں، بزرگوں اور عزیزوں وغیرہ میں باہم ربط وضبط کی شان دار عمارت قائم کی ہے۔

[1] جامع الترمذی، البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبیان، حدیث: 1919،
ومسند أحمد: 207/2

اسلام سے پہلے والدین کی سنگ دلی اور اسلام کی تعلیم

اسلام سے پہلے اہلِ عرب اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، ہندو بھی اپنی لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے، بیواؤں کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا، اس کو سَتی کی رسم کہا جاتا ہے۔ اسلام نے ان تمام رسموں کو ختم کر دیا، اولاد کو مار ڈالنے کے بجائے ان کی حفاظت کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ﴾

''اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی تمھیں اور انھیں رزق دیتے ہیں۔''①

مطلب یہ کہ والدین کا اولاد پر پہلا حق یہ ہے کہ وہ ان کی حفاظت کریں، اور اس پہلے حق میں یہ شامل ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں، کیونکہ اسی دودھ سے ان کی نشوونما ہوگی، ان کے اندر قوت وتوانائی آئے گی اور یوں ان کی حفاظت ہوگی۔ ماؤں کے اس حق کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ﴾

''مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت پوری کرنے کا ہو اور باپ کے ذمے دستور کے مطابق ان ماؤں کا روٹی کپڑا ہے۔''②

اگر ماں کسی وجہ سے بچے کو دودھ نہیں پلا سکتی تو اسلام نے یہ اجازت دی ہے کہ والدہ کے علاوہ دوسری عورت بچے کو دودھ پلا دے، اسے رضاعی ماں کہتے ہیں۔ اسلام میں رضاعی ماں کا

---

① الأنعام 151:6 ② البقرة 233:2

درجہ بھی قریباً حقیقی ماں کے برابر ہے۔ ماں بیماری اور کمزوری کی صورت میں بچے کی عام دودھ سے بھی پرورش کر سکتی ہے، مقصد تو معینہ مدت تک دودھ پلانا ہے تاکہ اس کی نشوونما مناسب طور پر ہو۔ والد پر فرض یہ ہے کہ بچے اور اس کی والدہ کی کفالت کرے۔ ان کے اخراجات برداشت کرے۔

علاوہ ازیں والدین پر یہ بھی فرض ہے کہ اولاد کو محبت اور شفقت سے پالیں اور مناسب پرورش کریں، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ لاَ يَرْحَمُ لاَ يُرْحَمُ»

''جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔''[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دیہاتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھا: کیا آپ بچوں کو چومتے ہیں؟ ہم تو ان کو نہیں چومتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَوَ أَمْلِكُ لَكَ أَنْ نَزَعَ اللهُ مِنْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ»

''اگر اللہ نے تیرے دل سے رحمت کو نکال لیا ہے تو میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''[2]

والدین پر اولاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اپنی اولاد کے درمیان تفریق نہ کریں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے درمیان مساوات قائم کرنے کا حکم فرمایا ہے، جیسا کہ ایک صحابی نے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو ایک غلام ہبہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ''کیا تم نے اپنے ہر بیٹے کو ایک ایک غلام ہبہ کیا ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: جی نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ أَشْهَدُ عَلَى جَوْرٍ»

---

[1] صحيح البخاري، الأدب، باب رحمة الوالد و تقبيله ومعانقته، حديث: 5997

[2] صحيح البخاري، الأدب، باب رحمة الوالد وتقبيله ومعانقته، حديث: 5998

"میں ایسے ظالمانہ عطیے پر گواہ نہیں بنوں گا۔"[1]

ہمارے ہاں بعض والدین یہ کرتے ہیں کہ کسی ایک لڑکے کے زیرِ اثر ہونے کی وجہ سے یا اس کی خدمت سے متأثر ہوکر اپنی جائیداد اپنی زندگی ہی میں اس کے نام کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنا معلمِ انسانیت ﷺ کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ لڑکا ماں باپ کی خدمت کرتا ہے تو اپنا فرض ادا کرتا ہے، اس فرض کی ادائیگی کے صلے میں وہ جنت کا حق دار بنتا ہے، لیکن والدین کے لیے مناسب نہیں کہ عدل وانصاف کا پہلو ہاتھ سے جانے دیں اور کم خدمت کرنے والی یا نالائق اولاد کو جائیداد سے محروم کر دیں۔ ان کی یہ محرومی کیا کم ہے کہ والدین انھیں پسند نہیں کرتے۔

اولاد کا ایک حق یہ ہے کہ والدین ان کی رزقِ حلال سے پرورش کریں، مائیں بھی یہ خیال رکھیں کہ ایامِ حمل اور دودھ پلانے کے دنوں میں بھی بچے کی پرورش حرام مال سے نہ ہو، یعنی ماں باپ حلال لقمہ ہی کھائیں، ورنہ بچہ بڑا ہو کر حرام اور حلال میں تمیز نہیں کر سکے گا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ چھوٹے سے تھے، انھوں نے صدقے کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ نبیٔ کریم ﷺ نے منہ میں انگلی ڈال کر فوراً اگلوائی اور آپ نے اس وقت فرمایا کہ "صدقہ آلِ محمد پر حرام ہے۔"[2]

اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ اولاد کے لیے پاک اور حلال خوراک کا مہیا کرنا بھی والدین کے ذمے ہے۔ والدین خود بھی حلال لقمہ کھائیں، تب ہی وہ اولاد کو حلال کھلا سکیں گے۔

اولاد کا ایک حق یہ ہے کہ والدین انھیں اچھی تعلیم دلائیں۔ اولاد سے محبت کا جذبہ تو انسانوں کے ساتھ ساتھ حیوانات میں بھی ہے۔ گائے، بھینس، بکری اور جملہ حیوان بھی اپنے

---

[1] صحیح البخاری، الشھادات، باب لایشھد علی شھادة جور إذا أشھد، حدیث: 2650، وصحیح مسلم، الھبات، باب کراھة تفضیل بعض الأولاد فی الھبة، حدیث: 1623

[2] مسند أحمد: 279/2

بچوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ انھیں فرطِ محبت سے چومتے ہیں، ان کی جدائی محسوس کرتے ہیں۔ ان کا بچہ مر جائے تو غم کی شدت سے دودھ دینا بند کر دیتے ہیں۔ ان کے بچے جب تک چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو جائیں، ان کی دیکھ بھال میں لگے رہتے ہیں۔ یہ فطری جذبہ حیوانات اور انسانوں میں مشترک ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے، اسے بہت سے اعلیٰ فرائض سونپے گئے ہیں، ان میں اولاد کی تعلیم و تربیت بھی شامل ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بعض اہلِ علم سے نقل کیا ہے کہ اللہ رب العزت قیامت کے دن اولاد سے والدین کے متعلق سوال کرنے سے پہلے والدین سے اولاد کے متعلق سوال کرے گا، کیونکہ جس طرح والدین کا اولاد پر حق ہے اسی طرح اولاد کا والدین پر حق ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''جس نے اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرنے میں کوتاہی کی اور اس کو نظر انداز کر دیا تو اس نے بہت بڑی غلطی کی، کیونکہ اولاد میں اکثر فساد، والدین ہی کی طرف سے آتا ہے اور اگر انھوں نے لاپروائی سے کام لیا اور دین کے فرائض وسنن کی تعلیم نہ دی تو ایسی اولاد نہ تو اپنے آپ کو فائدہ دے سکے گی اور نہ اپنے والدین کے لیے خیر کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ ایک باپ نے اپنے بیٹے کو اس کی بدسلوکی پر ڈانٹا تو اس نے کہا: ابا جان! آپ نے بچپن میں میرا حق خدمت ادا نہیں کیا تو میں نے بڑے ہو کر آپ کی نافرمانی کی ہے۔ آپ نے مجھے بچپن میں ضائع کیا تو میں آپ کو بڑھاپے میں ضائع کر رہا ہوں۔''[1]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ»

---

[1] تحفة المودود بأحكام المولود، ص: 193

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''[1]

والدین پر فرض ہے کہ وہ خود بھی علم حاصل کریں اور اپنی اولاد کو بھی علم کی دولت سے مالا مال کریں۔ والدہ کی گود بچے کے لیے پہلی اور بہترین درس گاہ ہے، حقیقت میں انسان کی سیرت ماں کی گود میں بنتی اور سنورتی ہے۔ بچے کا سب سے زیادہ رابطہ ماں کے ساتھ ہوتا ہے اور بچہ ماں اور اس کے ماحول کا اثر قبول کرتا ہے، لہٰذا والدہ ہی بچے کو ابتدائی تعلیم دے تاکہ اسے دینِ فطرت یعنی اسلام کی خوبیوں کا علم ہو اور اس کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھل سکے۔ اس کے علاوہ بچے کو سائنسی تعلیم کی ترغیب بھی دی جائے، کیونکہ سائنسی علوم کو حاصل کرنے سے انسان کارخانۂ قدرت میں اس کے قوانین سے آگاہ ہوگا اور اللہ کے احکام کے مطابق کائنات کی تسخیر کا فریضہ انجام دے سکے گا اور اس طرح حقیقی معنوں میں زمین میں خلیفہ ہونے کا خود کو حق دار ٹھہرا سکے گا۔

اولاد کا اہم حق ہے اخلاق کی تربیت۔ اسلام میں صرف ذاتی نجات کافی نہیں۔ اسلام یہ ذمے داری ہر شخص کے سپرد کرتا ہے کہ وہ دوسروں کی نجات کا بھی بندوبست کرے۔ خاندان کے سربراہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اہل وعیال کی ایسی تربیت کرے کہ وہ اللہ کی عظمت کے قائل ہوں، اللہ کے احکام کو مانیں اور آخرت کی فکر کریں۔ دنیاوی خوش حالی کے علاوہ ابدی زندگی میں سرخروئی کا خیال کریں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا ٱلنَّاسُ وَٱلْحِجَارَةُ﴾

''اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔''[2]

---

[1] سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، حديث: 224

[2] التحريم 6:66

نبیِ کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ، وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ»

''اپنی اولاد کو جب وہ سات سال کے ہو جائیں نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز (نہ پڑھنے) پر انھیں ماریں اور انھیں الگ الگ سلایا کرو۔''[1]

نبیِ کریم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کے پیشِ نظر والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو سات سال کی عمر تک نماز اور اخلاق کے بنیادی اصول سکھا دیں۔ عام طور پر والدین کی تربیت کا اثر ان کی اولاد میں ضرور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نبیِ اکرم ﷺ کی صاحب زادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شخصیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ان کی کس قدر بے مثال تربیت کی تھی۔

فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سب عورتوں سے بڑھ کر دانا تھیں۔ آپ کے بات کرنے کا انداز، حسنِ اخلاق، وقار اور متانت میں نبیِ کریم ﷺ کی سیرت کا عکس جھلکتا تھا۔

اسی طرح سیدنا علی، سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہم بھی نبیِ کریم ﷺ کے تربیت یافتہ تھے، ان کی زندگیاں اسلامی اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔

ایمان کے بعد دوسرا درجہ اعمالِ صالحہ کا ہے۔ قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔''[2]

---

[1] سنن أبي داود، الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، حديث: 495

[2] الكهف 107:18

معلوم ہوا کہ صحیح اسلامی زندگی کی گاڑی ان دو پہیوں کے بغیر نہیں چل سکتی، لہٰذا والدین کو چاہیے کہ اولاد میں عملِ صالح کا جذبہ پیدا کریں اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ والدین خود کھلی کتاب کی طرح رہیں۔ ان کا ظاہر اور باطن ایک ہو، قول اور فعل میں کوئی تضاد نہ ہوتا کہ وہ اولاد کے لیے نمونہ ہوں اور اولاد خود انھیں دیکھ کر اپنی اصلاح کرتی رہے۔

اب ہم بچوں کے وہ حقوق ترتیب وار بیان کریں گے جن کا ادا کرنا ماں باپ کے لیے ضروری ہے۔

اچھا نام تجویز کرنا

بچے کے اس دنیا میں آجانے کے بعد والدین کی ذمے داری ہے کہ اس کا اچھا سا نام تجویز کریں۔ اچھے نام رکھنے سے مراد ایسے نام ہیں جن میں عبدیت (اللہ کا بندہ ہونے) کا اظہار ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ أَحَبَّ أَسْمَائِكُمْ إِلَى اللهِ عَبْدُاللهِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ»

''تمھارے ناموں میں سے اللہ کو سب سے زیادہ محبوب نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔''[1]

نیک لوگوں کے ناموں پر نام رکھنا، جیسے انبیاء علیہم السلام، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر صلحاء وزہاد کے ناموں میں سے کوئی نام رکھ لیا جائے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وُلِدَ لِيَ اللَّيْلَةَ غُلَامٌ، فَسَمَّيْتُهُ بِاسْمِ أَبِي إِبْرَاهِيمَ»

[1] صحيح مسلم، الأداب، باب النهى عن التكنى بأبى القاسم، و بيان مايستحب من الأسماء، حديث: 2132

”رات میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اور میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیم کے نام پر رکھا ہے۔“[1]

حرام وحلال کا شعور پیدا کرنا

شعور آجانے کے بعد سب سے پہلے بچے کو حرام اور حلال کے احکام سکھانے چاہییں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے:

”اللہ کی اطاعت کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو، اور جن چیزوں کا حکم دیا گیا ہے، اپنی اولاد کو ان پر عمل کرنے اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے بچنے کا حکم کرو، اس لیے کہ یہ تمھارے اور ان کے لیے آگ سے بچنے کا ذریعہ ہیں اور اس میں راز یہ ہے کہ جب بچہ آنکھیں کھولے، تو وہ اللہ کے احکام پر عمل کرنے والا ہو اور ان کی بجاآوری کا اپنے آپ کو عادی بنائے۔“[2]

مطلب یہ کہ جن چیزوں سے روکا گیا ہے، ان سے بچے کو دور رکھنے کی کوشش کی جائے۔ جب بچپن ہی سے اس کا یہ رجحان بن جائے گا تو وہ اسلام کے علاوہ کسی دین اور مذہب کی طرف متوجہ نہیں ہوگا۔

عبادات کی ادائیگی کا حکم کرنا

اس سے اگلا مرحلہ ہے بچے کو عبادات کا عادی بنانا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

① صحیح مسلم، الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبیان والعیال وتواضعه......، حدیث: 2315

② تفسیر الطبری: 212/28

«مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعٍ، سِنِينَ وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ، وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ»

''اپنی اولاد کو سات سال کا ہونے پر نماز کا حکم کرو، جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو انھیں نماز (نہ پڑھنے) پر مارو اور ان کے بستر الگ کر دو۔''[1]

یہاں روزے کو بھی نماز پر قیاس کیا جائے گا، جب بچہ روزہ رکھنے کے قابل ہو جائے تو اسے روزہ رکھنے کے لیے بھی کہا جائے، عادت ڈالنے کے لیے اس سے روزے رکھوائے جائیں۔ باپ کے پاس گنجائش ہو تو بچے کو حج بھی کرایا جائے، اسی طرح دیگر احکام کا معاملہ ہے۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ بچہ شروع ہی سے یہ احکام سیکھ لے اور نوعمری ہی سے ان کو ادا کرنے کا عادی بن جائے۔ اسی طرح اللہ کی اطاعت اور اس کا شکر ادا کرنا سیکھ جائے اور اس کے ہر حکم پر گردن جھکانے کا وہ عادی بن جائے۔ علاوہ ازیں اسے معلوم ہو جائے کہ مدد صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی ہے۔ بھروسہ صرف اسی ذات پر کرنا ہے اور ہر مشکل کے وقت صرف اور صرف اسی کی طرف رجوع کرنا ہے۔

کوشش کے ساتھ اللہ سے دعا کرنا

اچھی تربیت کے ساتھ ساتھ والدین کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے کثرت سے دعائیں کریں، کیونکہ ان کی دعاؤں میں اللہ رب العزت نے قبولیت کی تاثیر رکھی ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ يُسْتَجَابُ لَهُنَّ لَا شَكَّ فِيهِنَّ: دَعْوَةُ الْمَظْلُومِ، وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ، وَدَعْوَةُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهِ»

---

[1] سنن أبي داود، الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، حديث :495

''تین دعاؤں کی قبولیت میں کوئی شک نہیں ہے: مظلوم کی دعا، مسافر کی دعا اور اولاد کے لیے والد کی دعا۔''[1]

ان دعاؤں میں والدین کو چاہیے کہ صرف دنیا ہی کو پیشِ نظر نہ رکھیں بلکہ دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کی آخرت کی بھی فکر کریں، جو کہ درحقیقت ہمیشہ کا مقام ہے۔ سورۂ ابراہیم میں اللہ رب العزت نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا ذکر کی ہے:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝﴾

''اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو نماز کا پابند بنا، اے ہمارے رب! میری دعا قبول فرما۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے یہ دعا فرمائی تھی:

''اے اللہ! اسے کتاب کا علم سکھا دے۔''[3]

ایک مرتبہ فضل بن زید رحمہ اللہ نے ایک دیہاتی عورت کے بچے کو دیکھا اور بہت حیران ہوئے۔ انھوں نے اس عورت سے بچے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا: جب اس بچے کی عمر پانچ سال ہوگئی تو میں نے اسے استاد کے حوالے کر دیا اور اس نے قرآنِ کریم یاد کر لیا، تلاوت اور تجوید سیکھ لی، پھر اسے عمدہ اشعار یاد کرائے گئے، اپنی قوم کے قابلِ فخر کارناموں کی تعلیم دی گئی، اس کے آباء واجداد کے کارنامے اسے بتائے گئے۔ جب یہ بلوغت کی عمر کو پہنچ گیا تو اسے گھوڑوں پر سوار کرایا گیا، اس طرح یہ بہترین شہسوار بن گیا۔ پھر ہتھیاروں سے لیس ہو کر محلے کے گھروں کا محافظ بن گیا اور مدد کے لیے پکارنے والوں کی طرف متوجہ ہونے لگا۔

---

① سنن ابن ماجه، الدعاء، باب دعوة الوالد و دعوة المظلوم، حديث: 3862

② إبراهيم 14:40

③ صحيح البخاري، العلم، باب قول النبي ﷺ: اللّٰهم علمه الكتاب، حديث: 75

مطلب یہ ہے کہ بچہ فطرۃً توحید اور اللہ پر ایمان کی حالت میں پیدا ہوتا ہے۔ اس میں اس وقت برائی نہیں ہوتی، اس کے بعد اگر گھر میں اچھی اور عمدہ تربیت اور معاشرے میں اچھے نیک ساتھی اور اسلامی ماحول میسر آ جائے تو بلاشبہ یہ بچہ پختہ ایمان والا بن جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ»

"ہر بچہ فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔"[1]

اب ذرا غور کریں! والدین اپنے بچوں کو غیر مسلموں کے سکولوں اور مشنری اداروں میں تعلیم دلواتے ہیں، وہاں بچے عیسائی اساتذہ سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں، وہ وہاں عیسائیت کے اثرات قبول کریں گے یا نہیں؟ دوسری طرف اگر ہم انھیں اچھے دینی ادارے میں تعلیم دلوائیں، جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، تو وہاں اسے قرآن اور حدیث کا علم ساتھ ساتھ ملے گا اور اس کی فطرت میں اسلام ہی رچ بس سکے گا...... نہ کہ عیسائیت اور مجوسیت۔

اخلاق و کردار کی اصلاح

اخلاق اور کردار کے اعتبار سے بچے کی تربیت نہایت ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شان میں قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝﴾

[1] صحيح البخاري، الجنائز، باب ماقيل في أولاد المشركين، حديث: 1385

''اور آپ بڑے عمدہ اخلاق پر ہیں۔'' ①

والدین کی ذمے داری ہے کہ اولاد کے عادات و اطوار اور ان کی مصروفیات کی نگرانی کریں۔ اچھے اخلاق کے حصول کے لیے ان کے دلوں میں ایمان اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا بیج بوئیں۔ بالخصوص ان کے فارغ اوقات کی نگرانی کریں اور ان اوقات کو مفید طریقے سے استعمال میں لانے کے لیے مفید مصروفیات کا اہتمام کریں۔ انھیں اچھا لٹریچر فراہم کریں تاکہ وہ گندے اور اخلاق سوز لٹریچر سے محفوظ رہ سکیں، انھیں قرآنِ کریم کے حفظ کرنے کی ترغیب دیں، قرآنِ کریم کا حفظ اور اس کے مفہوم و مطلب کا سمجھنا نفسوں کی پاکیزگی اور اوقات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ علم و حکمت کے چشمے ان کے دلوں میں جاری کرنے کا سبب بنتا ہے۔

جس طرح بھلائی کی باتیں سکھلانا والدین کی ذمے داری ہے اسی طرح بُرے کاموں اور برے لوگوں سے متنبہ کرنا بھی والدین اور بڑوں کی ذمے داری ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے اندر آنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:

«ائْذَنُوا لَهُ، بِئْسَ أَخُوالْعَشِيرَةِ، أَوِ ابْنُ الْعَشِيرَةِ» فَلَمَّا دَخَلَ أَلاَنَ لَهُ الْكَلاَمَ، قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ، قُلْتَ الَّذِي قُلْتَ: ثُمَّ أَلَنْتَ لَهُ الْكَلاَمَ؟ قَالَ: «أَيْ عَائِشَةُ! إِنَّ شَرَّ النَّاسِ مَنْ تَرَكَهُ النَّاسُ، أَوْ وَدَعَهُ النَّاسُ اتِّقَاءَ فُحْشِهِ»

''اسے اجازت دے دو، فلاں قبیلے کا یہ برا آدمی ہے۔'' جب وہ شخص اندر آیا تو آپ نے اس کے ساتھ بڑی نرمی سے گفتگو کی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں (اس کے چلے

① القلم 4:68

جانے کے بعد) میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ نے تو اس کے متعلق اس اس طرح کہا تھا، اور پھر اس کے ساتھ نرم گفتگو کی؟ آپ نے فرمایا: ''عائشہ! وہ آدمی بدترین ہے جسے اس کی بدکلامی کے ڈر سے لوگ چھوڑ دیں۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر سوار تھا، آپ نے مجھ سے فرمایا:

«يَا غُلَامُ! إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ احْفَظِ اللهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلاَّ بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ لَكَ، وَإِنِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلاَّ بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ»

''اے صاحب زادے! میں تمھیں چند باتیں بتاتا ہوں، تم اللہ (کے حقوق) کی حفاظت کرو، اللہ تمھاری حفاظت کرے گا۔ تم اللہ (کے حقوق) کا خیال رکھو، اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے، اور جب مانگو تو صرف اللہ ہی سے مانگو، اور جب مدد طلب کرو تو اللہ ہی سے مدد طلب کرو، اور اس بات کو جان لو کہ اگر تمام مخلوق بھی تمھیں فائدہ پہنچانا چاہے تو تمھیں اتنا ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے اور اگر سب مل کر بھی تمھیں نقصان پہنچانا چاہیں تو تمھیں اتنا ہی نقصان پہنچا سکتے ہیں جتنا اللہ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے۔''[2]

---

① صحيح البخاری، الأدب، باب مايجوز من اغتياب أهل الفسادوالريب، حديث:6054

② جامع الترمذی، صفة القيامة، باب حديث حنظلة، حديث: 2516

والدین پر یہ بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اولاد کو خیر سکھائیں، اخلاق کی بنیادی باتیں ان کے دل و دماغ میں راسخ کریں، بچپن ہی سے انھیں سچائی، امانت، استقامت، ایثار، پریشانیوں میں گھرے لوگوں کی مدد، بڑوں کا احترام، مہمانوں کا اکرام، پڑوسیوں کے ساتھ احسان اور دوسروں کے ساتھ محبت سے پیش آنے کا عادی بنائیں۔ تربیت دینے والے حضرات اس بات کے بھی ذمے دار ہیں کہ بچوں کی زبان کو گالی گلوچ، بُرا کہنے، گندے کلمات ادا کرنے اور اس طرح کی تمام چیزوں سے دور رکھیں، کیونکہ یہ چیزیں اخلاق کی خرابی کا سبب بنتی ہیں۔ یہ حضرات اس بات کے بھی ذمے دار ہیں کہ بچوں میں انسانی احساسات کا شعور بیدار کریں، مثلاً یتیموں کے ساتھ احسان کرنا، فقراء کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، بیواؤں اور مسکینوں پر شفقت کرنا، ان سے ہمدردی کرنا وغیرہ۔

چار بُری عادات

یہاں ہم بچوں میں عام طور پر پائی جانے والی چار بُری عادات کا ذکر کریں گے۔ وہ چار بُری عادات یہ ہیں: جھوٹ کی عادت، چوری کی عادت، گالی گلوچ کی عادت اور بے راہ روی اور آزادی کی عادت۔

جھوٹ کی عادت

اسلام کی نظر میں جھوٹ سب سے بُری خصلت ہے، تربیت کرنے والے تمام ذمے داروں کو چاہیے کہ اس کا بہت خیال رکھیں اور اس سلسلے میں خوب محنت کریں۔ بچوں کو اس سے ہر ممکن طریقے سے باز رکھیں، جھوٹ سے نفرت ان کے دلوں میں پختہ کر دیں کیونکہ جھوٹ کو نفاق کی خصلتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت

ہے، رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا ، أَوْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْ أَرْبَعٍ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا : إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ»

''جس شخص میں چار باتیں ہوں گی، وہ خالص منافق ہوگا، جس میں ان میں سے ایک خصلت ہوگی، اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہیں دے گا: جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، جب معاہدہ کرے تو عہد شکنی کرے جب جھگڑے تو گالی گلوچ پر اُتر آئے۔''[1]

اس حدیث سے جھوٹ کی قباحت ثابت ہوتی ہے، جھوٹ بولنے والا اللہ کی ناراضی اور نفرت میں گرفتار رہتا ہے۔سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ : شَيْخٌ زَانٍ ، وَمَلِكٌ كَذَّابٌ ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ»

''تین آدمی ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن گفتگو کرے گا، نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا، اور نہ ان کی طرف (نظرِ رحمت سے) دیکھے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: بوڑھا زانی، جھوٹ بولنے والا بادشاہ، اور مغرور فقیر۔''[2]

جو شخص جھوٹ کا عادی بن جاتا ہے، وہ اللہ کے ہاں جھوٹوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ

---

[1] صحيح البخاري، المظالم ، باب إذا خاصم فجر ، حديث :2459

[2] صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان غلظ تحريم إسبال الإزار ......، حديث : 107

يَهْدِي إِلَى النَّارِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا»

''جھوٹ سے بچو، اس لیے کہ جھوٹ برائیوں کی طرف لے جاتا ہے اور برائیاں جہنم کی طرف لے جاتی ہیں، اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔''①

لہٰذا والدین کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو جھوٹ سے نفرت دلائیں، اس سے انھیں روکیں، اور انھیں اس کے بُرے انجام سے ڈرائیں، اس کے نقصانات ان کے سامنے بیان کریں تاکہ وہ زندگی بھر جھوٹ کے نزدیک بھی نہ جائیں، اس کی دلدل میں نہ پھنسیں۔

مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں

نبیٔ کریم ﷺ نے تو مذاق میں بھی جھوٹ بولنے سے ڈرایا ہے کہ کہیں اللہ کے ہاں یہ مذاق بھی جھوٹ میں نہ لکھ دیا جائے۔ اسی طرح جس شخص نے یہ کہا کہ آؤ! فلاں چیز لے لو، اور پھر اسے کچھ نہ دیا، تو یہ بھی جھوٹ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میری والدہ نے مجھے پکارا، اس وقت رسول اللہ ﷺ بھی ہمارے گھر میں موجود تھے۔ میری والدہ نے مجھ سے کہا: آؤ! میں تمھیں یہ دوں گی۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے پوچھا: ''تم اسے کیا دینا چاہتی تھیں؟'' میری والدہ نے کہا: میں اسے کھجور دینا چاہتی تھی۔ اس پر نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَمَا إِنَّكِ لَوْ لَمْ تُعْطِيهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كِذْبَةٌ»

''سن لو! اگر تم اسے کچھ نہ دیتیں تو اس صورت میں یہ تمھارے لیے ایک جھوٹ

① صحيح مسلم، البر والصلة، باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله، حديث: 2607

لکھ دیا جاتا۔''[1]

سلف صالحین اپنے بچوں کو سچ بولنے کا عادی بنایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے ڈاکوؤں کو سچ سچ بتا دیا کہ ان کے پاس چالیس دینار ہیں، تو ان کے سچ بولنے کا ڈاکوؤں پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے ڈاکہ زنی جیسی بُری حرکت سے توبہ کر لی۔

ایک نہایت خطرناک رسم

جھوٹ کی ایک نہایت خطرناک صورت، اپریل فول کی رسم ہے جو یکم اپریل کو انگریزوں کی نقالی میں منائی جاتی ہے۔ اس میں کئی کمزور دل لوگ جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، جیسے کسی نے کسی بوڑھے باپ کو فون پر کہہ دیا کہ تمھارا فلاں بیٹا حادثے میں شدید زخمی ہو گیا ہے اور وہ ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے، جب کہ ایسا واقعہ پیش ہی نہیں آیا ہوتا، لیکن اس جھوٹی اطلاع سے بوڑھے ماں باپ پر جو گزرتی ہے وہ محتاجِ وضاحت نہیں، اس لیے اس قسم کی جھوٹی رسم منانے کا اسلام میں کوئی جواز نہیں۔ یہ جھوٹ کی قبیح ترین اور خطرناک ترین قسم ہے۔ اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

چوری کی عادت

جھوٹ کے علاوہ بچوں کو عام طور پر چوری کی عادت ہو جاتی ہے۔ یہ عادت بھی جھوٹ سے کچھ کم خطرناک نہیں۔ اس سلسلے میں اگر بچپن ہی سے بچے میں اللہ کا خوف اور اس کے وجود کا یقین بٹھا دیا جائے تو بلاشبہ وہ چوری، دھوکا بازی اور خیانت جیسے جرائم سے محفوظ رہے

[1] سنن أبي داود، الأدب، باب التشديد في الكذب، حديث: 4991

گا، اس لیے والدین اور تربیت کرنے والے دوسرے حضرات پر یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا یقین پیدا کریں، اس طرح ان میں اللہ کا خوف پیدا ہوگا۔ چوری کے بُرے اور خوفناک نتائج سے انھیں آگاہ کریں۔ خیانت کے بُرے انجام سے ڈرائیں اور انھیں صاف صاف کھول کر بتا دیں کہ روزِ قیامت ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوگا۔ بچوں کے پاس کوئی رقم یا کوئی اور قیمتی چیز نظر آئے تو ان سے فوراً پوچھیں، وہ یہ کہاں سے لائے ہیں۔ جو والدین یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، وہ اپنے بچوں کو چوری کا عادی بنانے میں تعاون کرتے ہیں، بچے عام طور پر اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ چیز فلاں جگہ پڑی تھی۔ وہاں سے انھوں نے اٹھائی ہے...... یا یہ ان کے کسی دوست نے انھیں دی ہے۔ اس بارے میں بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔

ایک شرعی عدالت نے ایک چور پر چوری کی سزا نافذ کرنے کا حکم دیا، جب سزا پر عمل درآمد کا وقت آیا تو اس نے بلند آواز میں کہا، میرا ہاتھ کاٹنے سے پہلے میری والدہ کی زبان کاٹی جائے، اس لیے کہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے پڑوسی کے ہاں سے ایک انڈا چرایا تھا، میری والدہ نے نہ مجھے برا بھلا کہا، نہ انڈا واپس کرنے کے لیے کہا، بلکہ خوش ہوئی اور بولی: اللہ کا شکر ہے کہ اب میرا بیٹا پورا آدمی بن گیا ہے۔ اگر میری ماں کے پاس اس جرم پر خوشی کا اظہار کرنے والی زبان نہ ہوتی تو آج میں چور نہ بنتا۔ ان تمام بُری حرکات سے بچانے کے لیے والدہ کی بھی یہ ذمے داری ہے کہ وہ حلال لقمہ کھائے، بچے کو پاک صاف دودھ پلائے یعنی ایسا دودھ جس میں حرام کی ملاوٹ نہ ہو۔

صحیح تربیت کے چند نمونے

غلط تربیت کا ایک نمونہ آپ نے ملاحظہ کیا۔ اب صحیح تربیت کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دودھ میں پانی نہ ملانے کا حکم جاری فرمایا۔ ماں بیٹی کا واقعہ آپ نے سنا ہی ہوگا۔ ماں چاہتی تھی کہ دودھ میں پانی ملا دیا جائے، جب کہ بیٹی ایسا کرنے سے انکار کر رہی تھی، وہ اسے امیر المومنین کا حکم یاد دلا رہی تھی، جب ماں نے یہ کہا کہ امیر المومنین کون سا دیکھ رہے ہیں تو بیٹی نے کہا: امیر المومنین نہیں دیکھ رہے تو اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے۔

عبداللہ بن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک چرواہا پہاڑ سے اتر کر ہماری طرف آیا۔ سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے اس کا امتحان لینے کے لیے فرمایا: اے چرواہے! ان بکریوں میں سے ایک بکری ہمارے ہاتھ بیچ دو۔ اس نے کہا: میں تو غلام ہوں، بکریاں میرے آقا کی ہیں۔ آپ نے اس سے کہا: تم اپنے آقا سے کہہ دینا اس بکری کو بھیڑیا کھا گیا۔ چرواہا بولا: پھر اپنے اللہ کو کیا جواب دوں گا! وہ تو دیکھ رہا ہے۔ یہ سن کر سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما رونے لگے۔ پھر اس غلام کے ساتھ اس کے آقا کے پاس گئے اور اسے خرید کر آزاد کر دیا اور اس سے فرمایا: تمھاری اس بات نے تمھیں دنیا میں آزاد کر دیا، مجھے امید ہے کہ یہی بات تمھیں آخرت میں بھی نجات دلائے گی۔[1]

گالی گلوچ کی عادت

بچے کو گالی گلوچ سے روکنا نہایت ضروری ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ گھر کے افراد مطلقاً کسی کو گالی نہ دیں۔ تربیت کرنے والے حضرات بچے کو گلی کوچے میں آزاد نہ چھوڑیں، ورنہ وہ بُرے ساتھیوں کے ساتھ رہے گا اور گالیاں ہی نہیں اور بھی بہت سی بری باتیں سیکھ لے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] صفة الصفوة لابن الجوزی: 188/2

«لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلاَ اللَّعَّانِ وَلاَ الْفَاحِشِ وَلاَ الْبَذِيِّ»

''مومن طعنہ دینے والا ہوتا ہے، نہ لعن طعن کرنے والا، فحش گو ہوتا ہے اور نہ گندی بے ہودہ باتیں کرنے والا۔'' [1]

بے راہ روی اور آزادی کی عادت

ہمارے معاشرے میں بے راہ روی اور آزادی نے بہت بگاڑ پیدا کیا ہے۔ بچوں کو آزاد چھوڑ دینا، انھیں کچھ کہنا، نہ کسی چیز سے ان کو روکنا، ہمارے اس رویے نے اولاد کو شتر بے مہار بھی بنا دیا ہے اور ہماری اسلامی اقدار وروایات سے بیگانہ اور متنفر بھی۔ ہمارا یہی رویہ بچیوں کے ساتھ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری بچیوں نے پردے کو خیر باد کہہ دیا ہے، حالانکہ بے پردگی نہایت خطرناک ہے۔ اسلام نامحرموں کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں فرماتا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝﴾

''اے نبی! آپ اپنی بیویوں، بیٹیوں اور ایمان والوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں۔ اس سے وہ جلد پہچان لی جایا کریں گی، پھر انھیں ستایا نہ جائے گا اور اللہ تو بڑی مغفرت والا، بڑی رحمت والا ہے۔'' [2]

اسی طرح اللہ تعالیٰ سورۂ نور میں فرماتا ہے:

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ

---

① جامع الترمذی، البر والصلة، باب ماجاء فی اللعنة، حدیث: 1977

② الأحزاب 59:33

وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ﴾

''(اے نبی!) آپ ایمان والوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے حق میں زیادہ صفائی کی بات ہے۔ بے شک اللہ کو سب خبر ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور آپ کہہ دیجیے ایمان والیوں سے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں، اور شرم گاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنا سنگار ظاہر نہ ہونے دیں مگر جو (از خود) اس میں سے ظاہر ہو اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں، اور اپنی زینت ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہر، اپنے باپ، اپنے خسر، اپنے بیٹوں، اپنے خاوندوں کے بیٹوں، اپنے بھائیوں، اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں پر۔''[1]

عورت کا چہرہ بھی پردہ ہے اور اس کا چھپانا بھی واجب ہے۔ اس کا کھولنا حرام ہے۔ مطلب یہ کہ بے راہ روی سے بچنے کے لیے پردہ انتہائی اہم ہے۔ اس کے بغیر بے راہ روی سے بچنا ممکن نہیں، لہٰذا والدین کو چاہیے کہ اپنی بیٹیوں کو پردے کا پابند بنائیں۔

بری صحبت سے بچانے کی ضرورت

والدین کی یہ ذمے داری بھی ہے کہ وہ جہاں گھر کے اندر بچے کی صحیح تربیت کریں، وہاں اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ بچہ باہر کی غلط صحبت سے بھی محفوظ رہے، ورنہ شدید خدشہ ہے کہ بیرونی غلط صحبت اس کی تعلیم و تربیت کو بھی بے اثر کر دے۔ اچھی اور بُری صحبت کی تاثیر کو

---

[1] النور:30,31 24

نبی کریم ﷺ نے اپنے فرمان میں یوں بیان کیا ہے:

«مَثَلُ الْجَلِيسِ الصَّالِحِ وَالْجَلِيسِ السُّوْءِ كَمَثَلِ صَاحِبِ الْمِسْكِ وَكِيرِ الْحَدَّادِ، لَا يَعْدَمُكَ مِنْ صَاحِبِ الْمِسْكِ، إِمَّا تَشْتَرِيهِ أَوْ تَجِدُ رِيحَهُ، وَكِيرُ الْحَدَّادِ يُحْرِقُ بَيْتَكَ أَوْ ثَوْبَكَ، أَوْ تَجِدُ مِنْهُ رِيحًا خَبِيثَةً»

''نیک اور برے ہم نشیں (ساتھی) کی مثال عطر فروش اور لوہار کی بھٹی کی سی ہے۔ عطر فروش کے پاس بیٹھنے سے یا تو اس سے عطر خرید لے گا یا اس کی خوشبو سے اپنے دماغ کو معطر کرلے گا، اور لوہار کی بھٹی یا تو تیرے گھر یا تیرے کپڑے کو جلا دے گی یا اس کی بدبو سے تیرا دماغ متعفن ہو جائے گا۔''[1]

جو والدین اپنے بچوں کو بُرے دوستوں اور بدکرداروں سے ملنے کی کُھلی چھٹی دے دیتے ہیں تو ان کے بچے نہ صرف بُرے لوگوں کے اخلاق سے متاثر ہوتے ہیں بلکہ وہ انھی کے رنگ میں رنگے بھی جاتے ہیں۔

اسی طرح جو والدین اپنے بچوں کو فلمیں اور ڈرامے دیکھنے کی اجازت دیتے ہیں، تو وہ گویا اپنی اولاد کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں۔

بری صحبت سے بچانے کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بگاڑنے والے لٹریچر سے بھی بچوں کو دور رکھنا چاہیے۔

والدین کے لیے یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ بچوں کے سکول جانے اور سکول سے آنے کی نگرانی رکھیں، ورنہ بچے بے توجہی سے فائدہ اٹھائیں گے اور گناہ کی جگہ میں وقت گزاریں گے۔

---

[1] صحيح البخاری، البیوع، باب فی العطار و بیع المسك، حدیث: 2101

والدین کو چاہیے کہ وہ ان کی کتابوں کی الماری کو بھی چیک کرتے رہیں، کہیں وہ کتابوں میں عریاں تصاویر تو چھپا کر نہیں رکھتے یا اخلاق کو خراب کرنے والے رسائل کا مطالعہ تو نہیں کرتے۔

ہم یہاں والدین اور تربیت کرنے والے سرپرستوں کے سامنے نبیٔ اکرم ﷺ کی چند احادیث پیش کرتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ»

''مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ ترین اخلاق کی تکمیل کروں۔''[1]

ابن مردویہ روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝﴾

''درگزر (کی عادت) اپنایئے اور نیک کام کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے پرہیز کیجیے۔''[2]

تو نبیٔ کریم ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' یعنی اس کا مطلب کیا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا کہ تم اس شخص کے ساتھ صلہ رحمی کرو جس نے تمھارے ساتھ قطع رحمی کی ہو اور تم اس شخص کو دو جس نے تمھیں محروم کیا ہو اور اس سے درگزر کرو جس نے تم پر ظلم کیا ہو، یعنی یہ ہے حسنِ اخلاق۔[3]

سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَا شَيْءٌ أَثْقَلَ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ»

''قیامت کے دن مومن کی ترازو میں حسنِ اخلاق سے بھاری کوئی چیز نہیں ہوگی۔''[4]

---

[1] موطأ الإمام مالك، كتاب حسن الخلق، حديث: 8

[2] الأعراف 7:199

[3] الدر المنثور للسيوطي: 2/281

[4] جامع الترمذی، البر والصلة، باب ماجاء فی حسن الخلق، حديث: 2002

مطلب یہ ہے کہ والدین اور تربیت دینے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کریں اور خود کو ان پر قائم رکھیں تا کہ بچوں کے لیے بہترین نمونہ پیش کر سکیں۔ جو اہل وعیال وغیرہ ان کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے لیے بہترین رہنما بنیں، ساتھ ہی اپنی اولاد کو چال چلن کے اسلامی آداب اور حسنِ اخلاق کی تربیت دیں تا کہ وہ ظلم کرنے والوں سے درگزر سے کام لیں، قطع تعلق کرنے والوں سے صلہ رحمی کریں، جو انھیں نہ دیں، یہ انھیں دیں، جو ان کے ساتھ برا سلوک کریں، یہ ان کے ساتھ نیک سلوک کریں تا کہ لوگوں میں بے مثال بن جائیں۔ زمین پر چلنے والے فرشتے بن جائیں اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے اس مبارک فرمان پر عمل کیا جائے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝﴾

''درگزر (کی عادت) اپنایئے اور نیک کام کرنے کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے اعراض کیجیے۔''[1]

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اپنی اولاد اور شاگردوں کے حق میں اخلاقی پہلو سے کوتاہی کی تو یاد رکھیے، جن کی تربیت کا آپ پر حق ہے، وہ آزادی، بے راہ روی اور بے حیائی میں نشوونما پائیں گے۔ پھر وہ امن کے لیے خطرہ بنیں گے۔ معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے کا سبب بنیں گے اور قوم کے افراد ان کی معاشرتی برائیوں سے پناہ مانگیں گے۔ اس لیے اپنی اولاد کی پوری طرح نگرانی کیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تربیت کی جو ذمے داری سونپی ہے، اس کو پورا کیجیے۔ اگر آپ نے صحیح طور پر یہ امانت ادا کر دی تو اپنے بچوں کو گھر میں خوشبودار مہکتے پھول کی طرح پائیں گے۔ معاشرے میں وہ ایسے فرد نظر آئیں گے جو پرسکون اور آرام سے زمین پر چلتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ التوبہ میں فرماتا ہے:

---

[1] الأعراف 199:7

﴿وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط﴾

''اور آپ کہہ دیجیے کہ عمل کیے جاؤ، پھر آگے اللہ دیکھ لے گا تمھارے کام کو اور اس کا رسول اور مومن۔''①

جسمانی صحت وقوت کا بھی خیال رکھا جائے

اسلام نے جو بڑی ذمے داریاں والدین اور تربیت کرنے والوں کو سونپی ہیں ان میں سے ایک جسمانی تربیت بھی ہے تاکہ بچے بہترین جسمانی طاقت، چستی اور تندرستی کے مالک ہوں۔ اس بارے میں جو پہلی چیز ہے، وہ بال بچوں پر خرچ کرنا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«دِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَدِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِي رَقَبَةٍ، وَدِينَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهِ عَلَى مِسْكِينٍ، وَدِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ عَلَى أَهْلِكَ، أَعْظَمُهَا أَجْرًا الَّذِي أَنْفَقْتَهُ عَلَى أَهْلِكَ»

''ایک دینار وہ ہے جس کو تم نے اللہ کے راستے میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جس کو تم نے کسی غلام کو آزاد کرنے پر خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جس کو تم نے کسی مسکین پر صدقہ کیا اور ایک دینار وہ ہے جس کو اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔ ان میں سب سے زیادہ اجر وثواب والا دینار وہ ہے جس کو تم نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔''②

جس طرح ماں باپ کو اہل وعیال پر خرچ کرنے پر ثواب ملتا ہے، اسی طرح اگر وہ ان پر تنگی کریں، خرچ نہ کریں تو انھیں گناہ بھی ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

---

① التوبة 9:105

② صحیح مسلم، الزکاۃ، باب فضل النفقة علی العیال ......، حدیث: 995

«كَفٰى بِالْمَرْءِ إِثْمًا، أَنْ يَحْبِسَ، عَمَّنْ يَمْلِكُ قُوتَهُ»

''انسان کے گناہ گار ہونے کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ان لوگوں پر خرچ کرنے سے رک جائے جن کے خرچ کا وہ مالک ہے۔''[1]

اہل وعیال پر خرچ کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ آدمی اپنے بیوی بچوں کے لیے صحیح غذا، قابلِ رہائش مکان اور قابلِ استعمال لباس مہیا کرے۔ اس کے علاوہ کھانے پینے اور سونے میں طبی قواعد اور حفظانِ صحت کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھے۔ کھانے کے بارے میں تو نبی کریم ﷺ کی رہنمائی یہ ہے کہ پیٹ بھر کر کھانے سے بچا جائے، ضرورت سے زیادہ کھانے پینے سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ سیدنا معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَا مَلَأَ آدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ، بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ أُكُلَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهُ، فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَةَ فَثُلُثٌ لِطَعَامِهِ وَثُلُثٌ لِشَرَابِهِ وَثُلُثٌ لِنَفَسِهِ»

''کسی آدمی نے (اپنے) پیٹ سے زیادہ بُرا برتن نہیں بھرا۔ ابن آدم کے لیے وہ چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر سیدھی رکھ سکیں۔ پس اگر انسان زیادہ کھانا ہی چاہے تو یہ کرلے کہ ایک تہائی حصہ کھانے کے لیے رکھے، ایک تہائی پانی کے لیے اور ایک تہائی حصہ سانس لینے کے لیے (خالی رکھے)۔''[2]

پانی کے بارے میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا عمل ذکر فرماتے ہیں کہ آپ پانی تین

---

① صحیح مسلم، الزکاۃ، باب فضل النفقة علی العیال ......، حدیث: 996

② جامع الترمذی، الزھد، باب ماجاء فی کراھیة کثرة الأکل، حدیث: 2380، ومسند أحمد: 132/4

سانسوں میں پیا کرتے تھے۔"[1]

علاوہ ازیں برتن میں سانس نہیں لینا چاہیے، اسی طرح کھڑے ہو کر پانی پینے سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ کھڑے ہو کر پینے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اور سانس لیتے وقت چاہیے کہ برتن کو منہ سے دور ہٹا لیا جائے۔ اگر پانی یا دودھ پلانے کا موقع ہو تو دائیں طرف سے شروع کر کے سب کو پلایا جائے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کے پاس دودھ لایا گیا جس میں پانی ملا ہوا تھا۔ آپ کے دائیں طرف ایک اعرابی اور بائیں طرف سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ آپ نے دودھ پی کر برتن اعرابی کو دے دیا اور فرمایا: دائیں طرف والا زیادہ حق دار ہے۔"[2]

اسی طرح بچوں کو سونے کے آداب سے آگاہ کیا جائے اور انھیں حالتِ طہارت میں سونے کا عادی بنایا جائے۔ انھیں تلقین کی جائے کہ وہ دائیں پہلو پر لیٹیں اور دعا پڑھنے کے بعد آغوشِ نیند میں جائیں۔ نبی کریم ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ایسے ہی سونے کا حکم دیتے تھے، چنانچہ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"جب تم اپنے بستر پر آؤ تو پہلے وضو کرو پھر اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ اور یہ دعا پڑھو:

«اَللَّهُمَّ إِنِّي أَسْلَمْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ، وَفَوَّضْتُ أَمْرِي إِلَيْكَ، وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِي إِلَيْكَ، رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ، لاَ مَلْجَأَ وَلاَ مَنْجَا مِنْكَ إِلاَّ إِلَيْكَ، آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ، وَبِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ»

---

[1] صحيح مسلم، الأشربة، باب كراهة التنفس في نفس الإناء......، حديث:2028

[2] صحيح البخاري، المساقاة، باب من رأى صدقة الماء وهبته ووصيته جائزة......، حديث:2352، وصحيح مسلم، الأشربة، باب استحباب إدارة الماء واللبن ونحوهما، على يمين المبتدئ، حديث:2029

''اے اللہ! میں نے اپنا چہرہ تیری طرف پھیر دیا اور اپنا معاملہ تیرے سپرد کر دیا اور اپنی پشت تیری طرف جھکا دی۔ تجھ سے امید اور رغبت رکھتے ہوئے اور تجھ سے ڈرتے ہوئے۔ تیرے سوا کوئی پناہ گاہ ہے اور نہ کوئی نجات کی جگہ۔ میں ایمان لایا اس کتاب پر جس کو تو نے نازل کیا، اور اس نبی پر جسے تو نے بھیجا۔''

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: دعا پڑھانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ان کلمات کو اپنا آخری کلام بناؤ، کیونکہ جس شخص نے ان کلمات کو پڑھا اور پھر اسی رات کو اس کی وفات ہوگئی تو وہ فطرتِ اسلام پر فوت ہوگا۔'' (مطلب یہ کہ اس دعا کے بعد بس سو جاؤ۔)[1]

جہادی تربیت

بچوں کو تیر اندازی، نیزہ بازی، تلوار چلانا وغیرہ سکھانا چاہیے اور آج کے دور کے مطابق بھی انھیں تربیت دینی چاہیے کیونکہ قرآن مجید نے کافروں کے خلاف حسبِ استطاعت قوت کی تیاری کا حکم دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ﴾

''اور تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو۔''[2]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ»

''طاقت ور مومن بہتر اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے، اس مومن کی نسبت جو کمزور ہو۔''[3]

---

① صحیح مسلم، الذکر والدعاء، باب الدعاء عندالنوم، حدیث: 2710

② الأنفال 8:60

③ صحیح مسلم، القدر، باب الإیمان بالقدر والإذعان له، حدیث: 2664

اسی لیے اسلام نے نیزہ بازی، تیر اندازی اور گھڑسواری سیکھنے کی ترغیب دی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑی ہو کر مسجد میں حبشیوں کو دیکھا کرتی تھی، وہ لوگ مسجد میں اپنے نیزوں اور برچھیوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چادر کے ساتھ میرے اوپر اوٹ کر دیتے تھے۔[1]

جہاں بچوں کو یہ فنون سیکھنے کی ہدایت فرمائی جائے وہاں یہ ہدایت بھی کی جائے کہ وہ ناز و نعم میں پڑنے سے بچیں، سادگی اختیار کریں، معمولی زندگی بسر کریں اور فنونِ حرب سیکھیں۔

چند نہایت خطرناک عادات

موجودہ دور میں بچوں، بڑوں، جوانوں اور بلوغت کو پہنچنے والے لڑکوں میں چند نہایت خطرناک عادات نظر آتی ہیں۔ یہ عادات تباہ کن ہیں۔ ہر ممکن طریقے سے بچوں کو ان عادات سے بچانا چاہیے۔ وہ عادات یہ ہیں:

سگریٹ نوشی، منشیات اور نشہ آور چیزوں کا استعمال، زنا اور اغلام بازی۔

یہ وہ خوفناک اور خطرناک عادات ہیں جو انسان کو ختم کر کے رکھ دیتی ہیں اور معاشرے میں انسان عضوِ معطل بن کر رہ جاتا ہے، مالی نقصانات کے ساتھ ساتھ ان میں جسمانی نقصان اس قدر ہے کہ انسان زندہ لاش اور معاشرے میں ناپسندیدہ بن جاتا ہے۔ ان تمام خطرناک بیماریوں اور عادات سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو عبادات کا پابند بنایا جائے، بری صحبت سے انھیں ہر حال میں بچایا جائے۔ ایسے بچوں کو اللہ کے خوف سے روشناس کرانا انتہائی ضروری ہے۔ نشہ آور چیزوں کو بھی اسلام واضح طور پر حرام قرار دیتا ہے۔ زنا اور اغلام بازی

---

[1] صحيح مسلم، صلاة العيدين، باب الرخصة في اللعب الذي لامعصية فيه في أيام العيد، حديث: 892

سے بچوں کو آتشک اور سوزاک کی ہولناک بیماری لگ سکتی ہے۔ یہ اس قدر ہولناک بیماریاں ہیں کہ انسان خود کو زندہ درگور محسوس کرتا ہے۔ پھر ان عادات سے چھوت کے امراض بھی لاحق ہو جاتے ہیں۔ دور حاضر کا خوفناک ترین مرض ایڈز بھی انھی عادات سے پیدا ہوتا ہے۔ زنا اور اغلام بازی کی قرآن و احادیث میں بڑی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ بنی اسرائیل میں فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰٓ إِنَّهُۥ كَانَ فَٰحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا﴾

''خبردار! زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا کیونکہ وہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی بری راہ ہے۔''①

شریعت نے ان جرائم کی سزائیں بھی مقرر کی ہیں۔ زانیوں کے اعتبار سے زنا کی دو سزائیں مقرر کی گئی ہیں: کنوارے کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی جبکہ شادی شدہ کو رجم کرنا یعنی سنگساری کی سزا۔ اس سزا میں مجرموں کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ یہی جمہور کا مسلک ہے۔ نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بھی یہی ہے۔ اغلام بازی کی بھی شریعت نے سزا مقرر کی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ وَجَدْتُّمُوهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُولَ بِهِ»

''جس شخص کو تم قومِ لوط والا کام کرتے ہوئے پاؤ تو اس کام کے کرنے والے اور کروانے والے دونوں کو قتل کر دو۔''②

---

① بنی إسرائيل 32:17

② سنن أبي داود، الحدود، باب فيمن عمل عمل قوم لوط، حديث: 4462

لہٰذا اس سلسلے میں زبردست احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ بچے کی عمر کے پہلے ہی سال اس کی حفاظت کی ذمے داری اہل خانہ پر ہے۔ بچوں کو جہاں اچھی باتوں کا درس دیا جائے وہاں انھیں خطرناک چیزوں سے بچنے کی تعلیم بھی دی جائے، انھیں لطیف انداز میں سمجھایا جائے کہ وہ چولہے، ہیٹر یا گرم برتن کو چھو کر خود کو نقصان نہ پہنچائیں یا جل نہ جائیں۔ دھار دار آلات اور شیشے کے برتن بچوں کی پہنچ سے دور رکھے جائیں۔ ان سب چیزوں کے خطرناک ہونے کا انھیں احساس دلایا جانا ضروری ہے۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ان کی دینی اور عقلی تربیت بھی بہت ضروری ہے۔ دین اسلام نے تعلیم کو لازمی اور ضروری بنایا ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ»

''علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''[1]

یہ حکم مردوں اور عورتوں دونوں کو ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی تعمیل میں تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں نے اپنے بچوں کو بنیادی علوم وفنون کی تعلیم دینے کی بہت کوشش کی، چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

عتبہ بن ابی سفیان رحمہ اللہ نے اپنے لڑکے کے استاد عبدالصمد کو ہدایت کی کہ وہ اسے اللہ کی کتاب کی تعلیم دیں اور پاکیزہ اشعار یاد کرائیں، احادیث اور عمدہ باتیں سکھائیں۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو فرمان جاری کیا کہ اپنے بچوں کو تیراکی اور شہسواری کی تعلیم دیں اور انھیں مشہور ضرب الامثال اور عمدہ اشعار یاد کرائیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو شخص قرآن کریم سیکھ لیتا ہے، اس کی وقعت بڑھ جاتی

---

[1] سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، حديث:224

ہے۔ اور جو فقہ میں غور وفکر کرتا ہے، اس کی قدر و منزلت بلند ہو جاتی ہے۔ اور جو احادیث لکھتا ہے، اس کی دلیل کی قوت مضبوط ہو جاتی ہے۔ اور جو شخص لغت کا مطالعہ کرتا ہے اس کی طبیعت میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جو حساب میں محنت کرتا ہے اس کی رائے میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

لڑکیوں کو بھی دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے

اسلام میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت بھی لازمی قرار دی گئی ہے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَكُونُ لِأَحَدٍ ثَلَاثُ بَنَاتٍ ، أَوْ ثَلَاثُ أَخَوَاتٍ فَيُحْسِنُ إِلَيْهِنَّ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ»

''جس کی تین لڑکیاں یا تین بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے، تو اسے جنت ملے گی۔''[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے لیے کچھ دن مخصوص فرمایا کرتے تھے۔ ان دنوں میں آپ انھیں وہ باتیں سکھاتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتائی تھیں اور ایسا آپ نے اس لیے کیا کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی، اس نے کہا: اللہ کے رسول! مرد تو آپ کی احادیث سن لیتے ہیں، آپ ہمارے لیے بھی ایک دن مقرر فرما دیجیے، جس میں ہم آپ کے پاس حاضر ہوں اور آپ ہمیں وہ باتیں سکھائیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلائی ہیں۔ تب آپ نے فرمایا کہ فلاں دن، فلاں جگہ جمع ہو جانا۔[2]

---

① صحيح الأدب المفرد للألباني: 103/1

② صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب تعليم النبي ﷺ أمته من الرجال والنساء مما علمه الله ......، حديث: 7310

فکری تربیت کا اہتمام

اسلام نے بچوں کے سلسلے میں والدین اور تعلیم دینے والوں پر ایک نہایت عظیم ذمے داری ڈالی ہے۔ وہ یہ کہ بچوں کو بچپن اور شروع ہی سے فکری اور ذہنی طور پر تیار کیا جائے۔ فکری تربیت کا مقصد یہ ہے کہ ان میں ان چیزوں کا ربط اور تعلق ہو۔ یعنی اسلام کے ساتھ دین اور حکومت کے اعتبار سے، قرآنِ کریم کے ساتھ نظام اور قانون کے اعتبار سے اور اسلامی تاریخ کے ساتھ عزت اور عظمت کے لحاظ سے اور اسلامی دعوت کے ساتھ نہایت جرأت مندانہ ربط اور لگاؤ کا جذبہ ہو۔

اس لیے تربیت کرنے والوں کی یہ ذمے داری ہے کہ بچہ جب سمجھ دار اور باشعور ہو جائے تو اسے مندرجہ ذیل باتیں اچھی طرح ذہن نشین کرائی جائیں:

اسلام ایک ابدی اور دائمی مذہب ہے اور یہ ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

دوسرا یہ کہ ہمارے آباء واجداد کو اسلام نے طاقت اور عزت بخشی تھی اس لیے کہ انھوں نے قرآنِ کریم اور اس کے احکام کو کلی طور پر اپنایا تھا۔

تیسرا یہ کہ اسلام کے دشمن سازشوں کے جو جال بچھاتے ہیں، ان سے ان کو آگاہ کیا جائے۔

چوتھا یہ کہ اسلام کی تہذیب اور تمدن کو کھول کھول کر اس کے سامنے بیان کیا جائے۔

پانچواں یہ کہ انھیں باور کرایا جائے کہ ہماری پہچان تاریخ میں نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے سے ہے۔

چھٹا یہ کہ مسلمانوں کی عظیم الشان فتوحات اور تاریخِ اسلام کے روشن ابواب سے انھیں روشناس کرایا جائے۔

ساتواں یہ کہ غیروں کی نقالی سے بچنے کی تلقین کی جائے اور عملاً ایسی رسموں سے بچا جائے اور بچوں کے ذہنوں میں غلط رسموں کی تباہ کاری و ہولناکی کا تصور راسخ کیا جائے جیسے پیدائش کی سالگرہ کی رسم، شادی کی سالگرہ کی رسم، اسی طرح شادی بیاہ کی فضول اور غیر اسلامی رسمیں ہیں۔ اپنی اولاد کو ان سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ بڑے ان تمام رسومات سے اجتناب کریں۔ بچے اور خواتین ان پر اصرار کریں تو ان کو سمجھائیں اور پوری سختی کے ساتھ ان کی باتوں کو رد کر دیں۔

نفسیاتی تربیت

بچوں کی نفسیاتی تربیت کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ بچہ جب عقل مند اور ہوشیار ہو جائے تو اسی وقت اسے جرأت، بے باکی، صداقت و شجاعت اور بہادری کی تربیت دی جائے۔ اسے کامل اور مکمل ہونے کا شعور دیا جائے۔ وہ دوسروں کے لیے خیر اور بھلائی پسند کرے، غصے پر قابو رکھے۔ مطلب یہ کہ اسے نفسیاتی اور اخلاقی فضائل اور کمالات سے آراستہ ہونے کی تربیت دی جائے۔

اساتذہ کو چاہیے کہ بچوں کو شرمیلے پن سے بچائیں، خوف و دہشت، احساسِ کمتری، حسد و بغض اور غیظ و غضب کی بیماری اس میں پیدا نہ ہونے دیں۔

بچوں کی غلطیوں کی اصلاح کس طرح کی جائے؟

اگر بچے سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس سلسلے میں اسلام نے بچے کی اصلاح نہایت مشفقانہ انداز میں کرنے کی ترغیب دی ہے اور علاج کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے کہ ہم نرمی اور پیار سے اسے اس کی غلطی پر تنبیہ کریں۔ مضبوط دلیل سے اسے یہ سمجھائیں کہ اس سے جو غلطی سرزد ہوئی

ہے، اسے کوئی بھی عقل مند انسان پسند نہیں کرتا۔ اس طرح وہ سمجھ جائے تو ٹھیک، ورنہ پھر علاج کا دوسرا طریقہ بھی ہے اور وہ ہے نرم انداز میں سزا دینا۔

اس کی ایک نادر مثال حدیث میں بیان ہوئی ہے، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اسے روکنے کے لیے دوڑے، لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«دَعُوهُ وَأَهْرِيقُوا عَلَى بَوْلِهِ ذَنُوبًا مِنْ مَاءٍ أَوْ سَجْلاً مِنْ مَاءٍ، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ »

''اسے چھوڑ دو اور پیشاب پر پانی کا ایک ڈول بہا دو، اس لیے کہ تمھیں آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، نہ کہ مشکلات اور سختی پیدا کرنے کے لیے۔''[1]

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ بچے کے ضرورت سے زیادہ ناز نخرے برداشت نہیں کرنے چاہییں۔ اس لیے کہ اس طرح بچے میں ضدی پن پیدا ہو جاتا ہے۔

بچے کو ہر وقت سینے سے بھی نہیں لگائے رکھنا چاہیے۔ ماؤں میں ایک نقص یہ ہے کہ بچے کو ایک منٹ کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں کہ کہیں وہ چوٹ نہ کھا لے، اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس کے برعکس بچے کو اپنے طور پر کچھ کرنے دیا جائے۔ اگر وہ میز پر چڑھ جائے یا قلم سے دیوار خراب کر دے تو ایسی صورت میں ماں کو چاہیے کہ بچے کو اچھے طریقے سے سمجھائے۔ زیادہ ناز نخرے اٹھانے کی بیماری ان گھروں میں زیادہ پائی جاتی ہے جہاں لڑکیاں زیادہ ہوں اور لڑکا بس ایک ہی ہو۔ سو اس لڑکے سے اتنا لاڈ پیار کیا جاتا ہے کہ وہ بگڑ جاتا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، الأدب، باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تعسروا، حدیث: 6128

بچوں کے درمیان مساوات کا اہتمام

ماں باپ اور اساتذہ اگر بچوں میں مساوات برقرار نہیں رکھیں گے، ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں گے، تو اس سے بھی بچے نفسیاتی مریض بنیں گے۔ ترجیحی سلوک حد درجے خطرناک ہے۔ لہٰذا والدین اور تربیت کرنے والوں کو چاہیے کہ تمام بچوں میں برابری قائم رکھیں، کیونکہ یکساں سلوک نہ کرنے سے نفرت جنم لیتی ہے۔ لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں، بچے ماں باپ سے بدظن یا باغی ہو جاتے ہیں۔

بچوں میں لینے دینے کے معاملے میں مساوات اور برابری کرنے کی بڑی تاکید ہے۔ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اعْدِلُوا بَيْنَ أَبْنَائِكُمْ، اعْدِلُوا بَيْنَ أَبْنَائِكُمْ»

”اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔ اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔“ ①

مذکورہ حدیث کی تفصیل صحیح بخاری میں سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے اس طرح مروی ہے کہ ان کے والد انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے اور عرض کیا: میں نے اپنے اس بیٹے کو اپنا ایک غلام ہدیتاً دیا ہے۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم نے ہر بیٹے کو ایسا ہی ہدیہ دیا ہے؟“ انھوں نے عرض کیا: جی نہیں، ایسا تو نہیں ہے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پھر اسے بھی واپس لے لو“ یعنی غلام دینا ہے تو سب کو دو، ورنہ اسے بھی نہ دو۔ ②

ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کے والد سے فرمایا:

«فَاتَّقُوا اللهَ وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ»

---

① مسند أحمد: 275/4

② صحيح البخاري، الهبة و فضلها والتحريض عليها، باب الهبة للولد، حديث: 2586

''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل و انصاف کرو۔''

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میرے والد واپس لوٹے اور اس ہدیے کو واپس لے لیا۔[1]

ان مثالوں سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اولاد میں عدل و انصاف، مساوات اور محبت میں برابری کرنی چاہیے تا کہ ان میں کسی قسم کی تفریق پیدا نہ ہو۔

یتیم کی کفالت کرنے کی فضیلت

اسلام نے یتیم بچے کا بھی بہت خیال رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت، کھانے پینے اور دوسری ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی تاکید اور فضیلت بیان کی ہے تا کہ معاشرے میں وہ ایک ایسا فرد بنے جسے اپنی ذمے داریوں کا احساس ہو۔ اپنے فرائض کو پورا کرے اور اپنے ذمے واجب دوسروں کے حقوق کو ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الماعون میں فرماتا ہے:

﴿ أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ ﴾

''کیا تو نے اسے بھی دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہی وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔''[2]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یتیم کے ساتھ بدسلوکی وہی کرتا ہے جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ آخرت پر یقین رکھنے والا کبھی یتیم کے ساتھ بے رحمانہ معاملہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یتیم کا بہت خیال رکھنے کا حکم دیا ہے اور اس کی کفالت پر اُبھارا ہے اور اس کی دیکھ بھال کو واجب قرار دیا ہے۔ اس کے سرپرست کو اس کا خیال رکھنے اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ ساتھ ہی جنت میں اپنے قریب ترین ساتھی ہونے کی

---

[1] صحيح البخاري، الهبة و فضلها والتحريض عليها ، باب الإشهاد في الهبة ، حديث : 2587

[2] الماعون 107:1،2

بشارت بھی سنائی ہے۔ سیدنا سھل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ» وَأَشَارَ بِإِصْبَعَيْهِ يَعْنِي السَّبَّابَةَ وَالْوُسْطَى

''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ فرمایا۔ ①

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أُحَرِّجُ حَقَّ الضَّعِيفَيْنِ: الْيَتِيمِ وَالْمَرْأَةِ»

''اے اللہ! میں دو ضعیفوں یعنی یتیم اور عورت کے حقوق (کے غصب کرنے) کو حرام کرتا ہوں۔'' ②

یعنی جو کوئی ان کا حق مارے گا وہ حرام کام کرے گا۔ یتیم کی دیکھ بھال اور کفالت اس کے رشتے داروں اور قرابت داروں پر واجب ہے، اس لیے وہ ان کے ساتھ خصوصی شفقت، توجہ اور دیکھ بھال سے کام لیں اور اپنے عمل سے انھیں یہ محسوس کرا دیں کہ محبت اور برتاؤ میں وہ ان کے لیے ان کی اولاد سے کم نہیں ہیں۔

غربت زدہ بچوں کی بھی خبر گیری کی جائے

غربت کی حالت میں جو بچے آنکھ کھولتے ہیں، وہ طرح طرح کی محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں کی بھی خبر گیری کی جائے اور ان سے حسبِ ضرورت وحسبِ گنجائش تعاون کیا جائے۔ اسی لیے اسلام نے زکاۃ کا نظام مقرر فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

① جامع الترمذی، البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة اليتيم و كفالته، حديث:1918

② سنن ابن ماجه، الأدب، باب حق اليتيم، حديث: 3678

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اہلِ یمن کی طرف روانہ کرتے ہوئے جو ہدایات دیں، ان میں ایک ہدایت یہ بھی تھی:

«فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ»

''ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں پر زکاۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے وصول کی جائے گی اور ان کے فقیروں پر تقسیم کی جائے گی۔''①

اب اگر مال دار لوگ زکاۃ نہ دیں تو گویا ایسے لوگ فقراء کو بے بسی میں مبتلا کریں گے اور اسلام نے اس مسلمان کو مسلمان شمار نہیں کیا جو خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بھوک کا شکار ہو اور اسے اس کی خبر بھی ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ گرامی ہے:

«لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَشْبَعُ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَى جَنْبِهِ»

''وہ شخص مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھالے اور اس کے پہلو میں (رہنے والا) اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔''②

بغض اور حسد سے بچایا جائے

بچے کو بغض اور حسد کی بیماری سے بچانے کی بھی شدید ضرورت ہے۔ حسد کا مطلب یہ ہے کہ انسان دوسرے کی نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرے۔ یہ ایک خطرناک معاشرتی بیماری

① صحيح البخاري، الزكاة، باب وجوب الزكاة، حديث: 1395

② الأدب المفرد، حديث:112، والمعجم الكبير للطبراني:3/175، وصححه الألباني في سلسلة الأحاديث الصحيحة: حديث 149

ہے۔ والدین اور اساتذہ اگر بچوں کی اس بیماری کا علاج نہیں کریں گے تو لازمی طور پر اس کے بدترین اور خطرناک نتائج نکلیں گے۔ حسد کی ابتدا دراصل گھر سے اس وقت شروع ہوتی ہے جب نیا بچہ پیدا ہوتا ہے اور تمام تر توجہ اس نئے بچے پر مرکوز کر دی جاتی ہے تو بڑے بچوں میں اس کے خلاف حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ گویا حسد کے مادے کی ابتدا ہے، لہٰذا ماں باپ اور اساتذہ کو چاہیے کہ بچوں میں برابری اور عدل و انصاف کا خاص لحاظ رکھیں۔ بڑے بچے کو ہرگز یہ محسوس نہ ہونے دیں کہ چھوٹے بھائی کی آمد کی وجہ سے اس سے کم محبت کی جا رہی ہے۔ حسد کی خطرناکیوں سے نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو ڈرایا ہے جیسا کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لاَ تَبَاغَضُوا وَلاَ تَحَاسَدُوا وَلاَ تَدَابَرُوا ، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا»

''ایک دوسرے سے بغض مت رکھو، ایک دوسرے سے حسد مت کرو اور ایک دوسرے سے دشمنی مت رکھو اور اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ۔''[1]

سیدنا ضمرہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لاَ يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا لَمْ يَتَحَاسَدُوا»

''لوگ اس وقت تک خیریت سے رہیں گے جب تک حسد نہ کریں۔''[2]

حسد اور رشک میں فرق

رشک کو عربی میں غبطہ کہتے ہیں اور یہ جائز ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان کسی شخص کو

---

① صحیح مسلم، البر والصلة ، باب تحريم التحاسد والتباغض والتدابر، حدیث:2559

② المعجم الكبير للطبراني، حدیث:8157، وقال الهيثمي في مجمع الزوائد: 78/8 (13045): رواه الطبراني ورجاله ثقات

علم وفضل میں، مال و دولت میں یا جاہ ومنصب میں اپنے سے بہتر اور برتر دیکھے تو خوش ہو اور آرزو کرے کہ کاش مجھے بھی اللہ تعالیٰ یہ نعمتیں عطا فرمائے۔ رشک میں انسان ان جیسی نعمتوں اورخوبیوں کی آرزو اور دعا کرتا ہے، جب کہ حسد یہ ہے کہ دوسرے کو اپنے سے برتر دیکھ کر جلتا اور کڑھتا ہے اور اس سے ان نعمتوں کے چھن جانے کی آرزو کرتا ہے، اس لیے حسد ممنوع ہے اور رشک کرنا جائز ہے۔

غصہ اور اس کی اقسام

غصہ ایک اخلاقی کمزوری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک جبلی وصف ہے یعنی یہ انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: پسندیدہ اور ناپسندیدہ۔ یہ ناپسندیدہ تب ہے جب انسان غصے میں قابو سے باہر ہو جائے، جذبات پر اس کا اختیار نہ رہے اور ایسی حرکتوں کا ارتکاب کرے جن پر بعد میں اسے پچھتانا پڑے۔ یہ یقیناً اخلاقی کمزوری ہے اور انسان کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ غصے کی دوسری قسم پسندیدہ ہے اور وہ ہے حق کی حمایت میں غضب ناک ہونا۔ اس کے بڑے فوائد ہیں۔ ہم میں غصہ نہ ہو تو کسی بھی معاملے میں غیرت نہیں کھائیں گے۔ اسلام دشمنوں کے خلاف حرکت میں نہیں آئیں گے۔ اسلامی احکام کی خلاف ورزیوں کے خلاف ہم ٹس سے مس نہیں ہوں گے، آبرو کی حفاظت نہیں کریں گے۔ اس لیے یہ غصہ عنداللہ پسندیدہ اور محمود ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کو بھی بعض موقعوں پر غصہ آتا تھا۔

جس غصے سے منع فرمایا گیا ہے یا جس پر قابو رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہے ذاتی مصلحت، ذاتی انا وغیرہ کی وجہ سے آنے والا غصہ۔ بات بات پر دوسروں پر غصہ جھاڑنا، اس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ گھریلو جھگڑے بڑھتے ہیں، میاں بیوی میں طلاق تک کی نوبت آجاتی ہے، ایسے غصے سے منع فرمایا گیا۔ بچوں کو تربیت کے ذریعے سے اس غصے پر قابو

پانے کے قابل بنایا جائے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے فرمایا:

«فَمَا تَعُدُّونَ الصُّرَعَةَ فِيكُمْ؟» قَالَ: قُلْنَا الَّذِي لاَ يَصْرَعُهُ الرِّجَالُ قَالَ: «لَيْسَ بِذٰلِكَ، وَلَكِنَّهُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ»

''تم اپنے میں پہلوان کسے سمجھتے ہو؟'' صحابہ کرام نے عرض کیا: جسے لوگ پچھاڑ نہ سکیں۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں، پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔''[1]

تربیت دینے والوں کو چاہیے کہ پہلے بچے میں غصے کے اسباب کا پتا چلائیں پھر ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ بچے کو اگر کھانا وقت پر نہیں ملتا تو اسے وقت پر کھانا دیا جائے۔ غصہ اگر کسی بیماری کی وجہ سے ہے تو اس بیماری کا علاج کروایا جائے، اس کی توہین ہونے پر غصہ آتا ہو تو توہین سے پرہیز کیا جائے۔ بلا وجہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کی جائے۔ اگر اس کا مذاق اڑایا جائے اور اسے غصہ آتا ہو تو مذاق اڑانے سے پرہیز بہت ضروری ہے۔

غصے کا نبوی علاج

بچے کو غصے کا وہ علاج بھی بتایا جائے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بتایا ہے۔ سیدنا سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا اور (قریب ہی) دو آدمی گالی گلوچ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا منہ سرخ ہو گیا اور گردن کی

[1] صحیح مسلم، البر والصلة، باب فضل من یملك نفسه عندالغضب............، حدیث: 2608

رگیں پھول گئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ، لَوْ قَالَ: أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ»

''مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ شخص اسے پڑھ لے تو اس کا غصہ جاتا رہے گا۔ اگر یہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ لے (تو اس کا غصہ جاتا رہے گا۔)''[1]

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ، فَإِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَإِلاَّ فَلْيَضْطَجِعْ»

''جب کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اس طرح کرنے سے اگر غصہ دور ہو جائے تو ٹھیک ورنہ لیٹ جائے۔''[2]

یہ ہدایات نہایت اہم ہیں۔ بچوں کو اچھی طرح سمجھائی جائیں۔

اجتماعی اور معاشرتی تربیت کی ضرورت

اجتماعی اور معاشرتی تربیت کا مقصد یہ ہے کہ بچے کو شروع ہی سے ایسے اعلیٰ معاشرتی آداب اور عظیم نفسیاتی اصولوں کا عادی بنایا جائے جن کی بنیاد پر وہ معاشرے کا ایک مثالی فرد بن سکے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس میں تقویٰ پیدا کیا جائے۔ تقویٰ کا مطلب ہے کہ بچہ اللہ کو خالق و مالک جانے، اس کا خوف اس کے دل میں ہو، اس کے عذاب سے ڈرے، اس سے

---

[1] صحیح البخاری، الأدب، باب الحذر من الغضب، حدیث: 6115

[2] سنن أبی داود، الأدب، باب مایقال عند الغضب، حدیث: 4782

معافی کی امید رکھے۔علماء نے تقویٰ کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس جگہ نہ دیکھے جہاں سے اس نے اسے منع کیا ہے اور وہاں سے غائب نہ ہو جہاں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔بعض علماء نے تقوی کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ اچھے اعمال کر کے اللہ کے عذاب سے بچنا اور ظاہر اور باطن میں اللہ تعالیٰ سے خوف کھانا۔اسی لیے قرآنِ کریم نے بہت سی آیات میں تقویٰ کی فضیلت کا ذکر کیا ہے اور تقوی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

اخوت اور بھائی چارے کی فضا قائم کی جائے

تقوی کے بعد اخوت کا نمبر آتا ہے۔اللہ تعالیٰ سورۂ حجرات میں فرماتا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾

''بے شک مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ»

''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔''[2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ»

''تم میں سے کوئی بھی شخص اس وقت تک (کامل) ایمان دار نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہ چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''[3]

---

① الحجرات 10:49

② صحیح مسلم، البر و الصلة، باب تحریم الظلم، حدیث: 2580

③ صحیح البخاری ، الإیمان ، باب من الإیمان أن یحب لأخیه...... ، حدیث : 13

یہ ہے اخوت۔ اس سے اسلامی معاشرے میں ایسی خوش گوار فضا قائم ہوتی ہے کہ غیر مسلم قومیں اس کی مثال پیش نہیں کر سکتیں۔ مطلب یہ کہ اپنی اولاد میں اخوت کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قحط پڑا، انھی دنوں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے غلے کے اونٹ آئے۔ تاجروں نے اس غلے کو مہنگے داموں خریدنا چاہا، لیکن سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اس غلے کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ ایسی اخوت کے جذبات بچے میں پیدا کیے جائیں۔

پیار محبت کا برتاؤ کیا جائے

اسلامی معاشرے میں اخوت کے ساتھ رحم اور شفقت بھی اہم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ ، ارْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ»

''رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''[1]

ایثار کا جذبہ پیدا کیا جائے

رحم کے جذبے کے ساتھ بچوں میں ایثار کا جذبہ بھی پیدا کیا جائے۔ ایثار ایک بہت اعلیٰ خصلت ہے۔ ایثار اگر اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے تو یہ ایمان کی صداقت اور باطن کی صفائی کی علامت ہے۔ ایثار کا مطلب ہے، دوسروں کے لیے قربانی دینا، اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دینا۔

---

[1] جامع الترمذی ، البر و الصلة ، باب ماجاء فی رحمة الناس ، حدیث : 1924

عفو ودرگزر کی عادت ڈالی جائے

ایثار کے علاوہ بچوں میں عفو ودرگزر کا مادہ پیدا کیا جائے۔ یہ بھی ایک شاندار نفسیاتی شعور ہے۔ کوئی ہم سے زیادتی کرے اور ہم اس سے درگزر کریں، اسے معاف کردیں، چاہے زیادتی کرنے والا ظالم اور سرکش ہی کیوں نہ ہو اور مظلوم بدلہ لینے پر قادر ہو۔ ایسا کرنا تقویٰ کے سب سے زیادہ قریب ہے جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾

''اور تمھارا معاف کردینا تقویٰ کے بہت نزدیک ہے اور آپس کی فضیلت اور بزرگی کو فراموش نہ کرو۔''[1]

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے عفو ودرگزر کی فضیلت اور حکمت کو یوں بیان کیا ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ۝﴾

''اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتی، آپ نیکی سے بدی کو ٹال دیا کیجیے تو پھر یہ ہوگا کہ جس شخص میں اور آپ میں عداوت ہے، وہ ایسا ہوجائے گا جیسا کہ دلی دوست ہو۔''[2]

یعنی درگزر کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ دشمن بھی دوست بن جائے گا۔

جرأت و بہادری کا جذبہ پیدا کیا جائے

عفو ودرگزر کے بعد جرأت اور بہادری کے جذبات پیدا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ یہ ایک عمدہ نفسیاتی قوت ہے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

① البقرة 237:2 ② حٰمٓ السجدة 34:41

«إِنَّ مِنْ أَعْظَمِ الْجِهَادِ كَلِمَةَ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ»

''بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔''[1]

یعنی حق بات کہنے کی جرأت بچے میں پیدا کریں۔ وہ جہاں بھی ہو، جس حال میں بھی ہو، اس میں حق بات کہنے کا حوصلہ ہو۔

حقوق کی پاسبانی کا جذبہ پیدا کیا جائے

بچے کے سامنے دوسروں کے حقوق کی اہمیت وفضیلت واضح کی جائے تاکہ وہ دوسروں کے حقوق کو پہچانے اور ان کی پاسبانی کرے۔ بچے کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے ذمے دوسروں کے کیا حقوق ہیں، والدین کے حقوق کیا ہیں، رشتے داروں کے حقوق کیا ہیں، پڑوسی کا حق کیا ہے، استاد کا حق کیا ہے، ساتھی کا حق کیا ہے اور بڑوں کے حقوق کیا ہیں؟ تاکہ وہ انھیں احسن طریقے سے ادا کرنے کی کوشش کرے۔

حیا کی اہمیت وفضیلت سے آگاہ کیا جائے

حیا ایک اہم وصف ہے جسے بچوں میں پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسی عادت ہے جو انسان کو برائیوں کے چھوڑنے پر اُبھارتی ہے۔ ہر حق دار کو اس کا حق دینے پر مجبور کرتی ہے، اس لیے حیا ہر طرح سے خیر ہی خیر ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَا كَانَ الْفُحْشُ فِي شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ، وَمَا كَانَ الْحَيَاءُ فِي شَيْءٍ

---

[1] سنن أبي داود، الملاحم، باب الأمر والنهي، حديث :4344، وجامع الترمذي، الفتن، باب ماجاء أفضل الجهاد......، حديث :2174

إِلاَّ زَانَهُ»

’’فحاشی اور بے حیائی جس چیز میں بھی ہوتی ہے، اسے عیب دار بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں بھی ہوتی ہے، اسے مزین اور آراستہ کر دیتی ہے۔‘‘[1]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ»

’’حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔‘‘[2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ لِكُلِّ دِينٍ خُلُقًا ، وَخُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ»

’’ہر دین کی ایک عادت، ایک مزاج اور ایک خاص امتیاز ہوا کرتا ہے، اور اسلام کا خاص امتیاز حیا ہے۔‘‘[3]

---

① جامع الترمذی، البر والصلة، باب ماجاء فی الفحش ، حدیث :1974

② صحیح البخاری، الأدب ، باب الحیاء، حدیث : 6118، وصحیح مسلم، الإیمان، باب بیان عدد شعب الإیمان وأفضلها وأدناها......، حدیث : 35

③ سنن ابن ماجه، الزهد، باب الحیاء ، حدیث :4181

معاشرتی آداب

بچوں کوعمومی معاشرتی آداب کا پابند کرنا، یہ بھی بہت اہم ہے۔ بچے کی معاشرتی تربیت کے سلسلے میں اسلام نے جن قواعد کو مقرر کیا ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ بچے کو شروع ہی سے عمومی معاشرتی آداب کا عادی بنایا جائے، اہم بنیادی تربیتی اصول اسے سکھائے جائیں، بلکہ اس کی عادت میں شامل کر دیے جائیں تا کہ بچہ جب ذرا بڑا ہو تو دوسروں کے ساتھ اس کا برتاؤ اور معاملہ بہت اچھا اور ہمدردانہ ہو۔ اسلام نے بچے کی اخلاقی تربیت اور معاشرتی و اجتماعی شخصیت سازی کے لیے تربیتی اصول مقرر کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ذیل میں درج عنوانات کے تحت بات کریں گے۔

کھانے پینے کے آداب، سلام کے آداب، اجازت طلب کرنے کے آداب، مجلس کے آداب، بات چیت کے آداب، مزاح اور مذاق کے آداب، مبارک باد دینے کے آداب، بیمار پرسی کے آداب، تعزیت کے آداب، چھینک اور جمائی کے آداب۔

کھانے پینے کے آداب

بچوں کو کھانے کے آداب سکھانے چاہییں اور یہ نوٹ کرنا چاہیے کہ وہ ان پر کتنا عمل کر رہے ہیں۔ بچوں کو بتایا جائے کہ کھانے سے پہلے اگر ہاتھ گندے ہوں تو دھو لیے جائیں اور اسی طرح کھانے کے بعد اگر ہاتھ چکنے یا گندے ہو جائیں تو ہاتھ دھو لیں۔ ساتھ

ہی انھیں بتایا جائے کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَذْكُرِ اسْمَ اللهِ فَإِنْ نَسِيَ أَنْ يَذْكُرَ اسْمَ اللهِ فِي أَوَّلِهِ فَلْيَقُلْ: بِسْمِ اللهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ»

''جب تم میں سے کوئی شخص کھائے تو اللہ تعالیٰ کا نام لے (کر شروع کرے) اگر شروع میں اللہ کا نام لینا بھول جائے تو یہ کہے: بِسْمِ اللهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ یعنی میں اس کے شروع میں اور آخر میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر (کھاتا ہوں۔)''[1]

کھانا کھانے کے بعد مندرجہ ذیل دعا پڑھنی چاہیے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو شخص کھانا کھانے کے بعد یہ دعا پڑھ لیتا ہے اس کے سابقہ تمام (صغیرہ) گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔'' وہ دعا یہ ہے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَطْعَمَنِي هٰذَا وَرَزَقَنِيهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّي وَلَا قُوَّةٍ»

''ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے یہ کھانا مجھے کھلایا اور مجھے یہ کھانا عطا کیا بغیر میری کسی طاقت کے اور بغیر میری کسی قوت کے۔''[2]

کھانے کے آداب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کھانے کی برائی نہ کی جائے۔ اچھا لگے تو کھالیں، پسند نہ آئے تو چھوڑ دیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے میں عیب جوئی کو ناپسند فرمایا ہے۔

---

① سنن أبي داود، الأطعمة، باب التسمية على الطعام، حديث: 3767، و جامع الترمذي، الأطعمة، باب ماجاء في التسمية على الطعام، حديث: 1858

② جامع الترمذي، الدعوات، باب مايقول إذا فرغ من الطعام، حديث: 3458

کھانا دائیں ہاتھ سے کھائیں۔
برتن کے ہر طرف سے نہ کھائیں بلکہ اپنے سامنے سے کھائیں۔
کھانا ٹیک لگا کر نہ کھائیں۔
کھانے کے دوران میں بات چیت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ نبیٔ کریم ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے باتیں کر لیا کرتے تھے۔
اگر آپ کسی کے گھر مہمان ہیں تو کھانے کے بعد اس کے حق میں دعا کریں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس گھر تشریف لے گئے تو وہ روٹی اور زیتون کا تیل لائے۔ کھانے سے فراغت کے بعد آپ نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی:

«أَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُونَ وَأَكَلَ طَعَامَكُمُ الْأَبْرَارُ وَصَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلَائِكَةُ»

"روزہ رکھنے والے لوگ تمھارے پاس روزہ افطار کریں اور نیک لوگ تمھارا کھانا کھائیں اور تم پر فرشتے رحمت بھیجیں۔"[1]

کھانے کا ایک ادب یہ ہے کہ اگر کھانے میں کوئی بڑا شریک ہو تو پہلے اسے کھانا شروع کرنے دیں۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی کھانے میں شریک ہوتے تو اس وقت تک برتن میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے جب تک کہ رسول اللہ ﷺ برتن میں ہاتھ نہ ڈالیں۔"[2]

کھانے کا ایک اہم ادب یہ ہے کہ کھانے سے فراغت کے بعد ہاتھ دھونے سے قبل انگلیاں چاٹ لی جائیں۔ سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ جب

---

(1) سنن أبي داود، الأطعمة، باب في الدعاء لرب الطعام إذا أكل عنده، حديث: 3854
(2) صحيح مسلم، الأشربة، باب آداب الطعام والشراب و أحكامهما، حديث: 2017

کھانے کی کوئی چیز تناول فرماتے تو اپنی تینوں انگلیاں چاٹ لیا کرتے تھے۔"①

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا وَقَعَتْ لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أَذًى وَلْيَأْكُلْهَا، وَلاَ يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ، وَلاَ يَمْسَحْ يَدَهُ بِالْمِنْدِيلِ حَتَّى يَلْعَقَ أَصَابِعَهُ، فَإِنَّهُ لاَ يَدْرِي فِي أَيِّ طَعَامِهِ الْبَرَكَةُ»

"جب تم میں سے کسی کا لقمہ گر جائے تو اسے چاہیے کہ اس کو اٹھا لے اور اگر اس پر کچھ لگ گیا ہو تو صاف کر کے کھا لے۔ اس کو شیطان کے لیے نہ پڑا رہنے دے۔ اور اپنے ہاتھ رومال سے صاف کرنے سے پہلے اپنی انگلیوں کو چاٹ لے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے۔"②

پینے کے آداب

پینے کا ادب یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر پییں اور تین سانسوں میں پییں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آج کل دعوتوں وغیرہ میں لوگ کھڑے ہو کر اور چل پھر کر کھاتے ہیں، یہ طریقہ ناپسندیدہ ہے۔ جب کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ بیٹھ کر کھائیں پییں۔

کھانا بہت زیادہ نہ کھائیں، کیونکہ کھانے کی زیادتی معدے کی کمزوری اور سستی و کاہلی کا سبب ہے۔ کھانا تھوڑا کھائیں اور اس وقت کھائیں جب بھوک لگے۔ ہر وقت یا تھوڑے تھوڑے وقفے سے مسلسل کھاتے رہنا نظامِ انہضام کو خراب کر دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کم کھانے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ کا ارشادِ گرامی ہے:

---

① صحيح مسلم، الأشربة، باب استحباب لعق الأصابع......، حديث :2032

② صحيح مسلم، الأشربة، باب لعق الأصابع والقصعة......، حديث :2033

«مَا مَلَأَ آدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ، بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ أُكُلَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهُ، فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَةَ فَثُلُثٌ لِطَعَامِهِ وَثُلُثٌ لِشَرَابِهِ وَثُلُثٌ لِنَفَسِهِ»

''کسی آدمی نے اپنے پیٹ سے بُرا برتن نہیں بھرا۔ ابنِ آدم کے لیے وہ چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا رکھیں، لیکن اگر تم اور زیادہ کھانا چاہتے ہو تو ایک حصہ کھانے کے لیے اور ایک حصہ پانی کے لیے اور ایک حصہ سانس لینے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔''[1]

سلام کرنے کے آداب

سلام کرنے کے آداب بھی بچے میں پختہ کیے جائیں۔

بچوں کو بتائیں کہ کسی کے گھر میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں۔ اجازت کے بعد جب گھر میں داخل ہوں تو اہلِ خانہ کو سلام کریں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ النور میں فرماتا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ﴾

''اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جب تک کہ اجازت نہ حاصل کرلو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو۔''[2]

سلام کرنا بڑی فضیلت والا عمل ہے۔ ایک دوسرے کو سلام کہنے سے آپس میں پیار محبت بڑھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

---

[1] جامع الترمذی، الزهد، باب ماجاء فی كراهية كثرة الأكل، حديث: 2380

[2] النور 27:24

«لاَ تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا، وَلاَ تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا، أَوَ لاَ أَدُلُّكُمْ عَلَى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلاَمَ بَيْنَكُمْ»

''تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو گے جب تک مومن نہ بن جاؤ اور مومن اس وقت تک نہیں بنو گے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتا دوں کہ جب تم وہ کر لو تو آپس میں محبت کرنے لگو گے؟ آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔''[1]

تربیت دینے والوں کو چاہیے کہ بچوں کو سلام کے طریقے بتائیں۔

اجازت طلب کرنا

جو بچے ابھی سنِ بلوغت کو نہیں پہنچے، انھیں تعلیم دیں کہ وہ گھر میں آنے کی اجازت مانگا کریں۔ خاص طور پر تین اوقات میں۔ فجر سے پہلے، اس لیے کہ اس وقت لوگ بستروں میں سوئے ہوتے ہیں۔ دوپہر کے وقت، کیونکہ یہ قیلولے کا وقت ہوتا ہے۔ تیسرا عشاء کے بعد کہ یہ آرام اور سونے کا وقت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ النور میں فرماتا ہے:

﴿وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ﴾

''اور تمھارے بچے بھی جب بلوغت کو پہنچ جائیں تو جس طرح اُن کے اگلے لوگ اجازت مانگتے ہیں اُنھیں بھی اجازت مانگ کر آنا چاہیے۔''[2]

---

[1] صحیح مسلم، الإیمان، باب بیان أنه لا یدخل الجنة إلا المؤمنون ......، حدیث:54

[2] النور 59:24

قرآنِ کریم کی ان ہدایات سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اسلام بچوں کی معاشرتی تربیت اور کردار و اخلاق سازی کا بہت اہتمام کرتا ہے تا کہ بچہ جب سنِ بلوغ کو پہنچے تو وہ آداب اور اخلاق میں اور اپنی تمام زندگی میں ایک کامل انسان ہو۔

اجازت لینے کے آداب

اجازت لینے کے بہت سے آداب ہیں، تربیت دینے والے وہ تمام آداب بچوں کو سکھائیں۔ مثلاً یہ کہ دروازے پر بہت زور سے دستک نہ دیں، ایک مرتبہ دستک دینے کے بعد انتظار کریں، دستک پر دستک نہ دیے جائیں۔ انتظار کے بعد دوسری دستک دیں اور پھر انتظار کریں۔ پھر تیسری مرتبہ دستک دیں اور انتظار کے باوجود کوئی جواب نہ آئے تو واپس چلے جائیں۔ دروازہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر سارے محلے کو پریشان نہ کریں۔ یہی معاملہ گھنٹی بجانے کا ہے، یہ بھی آہستہ سے صرف ایک مرتبہ بجائیں۔ انتظار کے بعد دوسری مرتبہ بجائیں، پھر انتظار کے بعد تیسری مرتبہ بجائیں اور جواب نہ ملنے پر لوٹ جائیں۔ گھنٹی بھی اس طرح بے ہنگم طریقے سے نہ بجائیں کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ اسی طرح آرام کے اوقات میں دستک دینے یا گھنٹی بجانے سے گریز کریں۔ علاوہ ازیں اجازت طلب کرتے وقت دروازے کے بالکل سامنے کھڑے نہ ہوں بلکہ ایک طرف کو ہٹ کر کھڑے ہوں۔

مجلس کے آداب

بچوں کو مجلس کے آداب سکھانا بھی بہت ضروری ہے۔ مجلس کے آداب یہ ہیں کہ مجلس میں جس سے ملیں، اس سے مصافحہ کریں۔ صاحبِ مکان جس جگہ بٹھائے، اسی جگہ بیٹھ جائیں، لوگوں کے درمیان جا کر نہ بیٹھیں۔ دو شخص بیٹھے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر ان کے درمیان

نہ بیٹھیں۔ مجلس میں آنے والوں کو چاہیے کہ وہیں بیٹھ جائیں، جہاں مجلس ختم ہو رہی ہے، لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے جانے کی کوشش نہ کریں۔

مجلس میں تین شخص ہوں تو دو شخص مل کر تیسرے سے پوشیدہ کوئی بات نہ کریں۔ یعنی سرگوشی نہ کریں۔ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے مجلس سے اٹھ کر چلا جائے اور پھر مجلس میں آ جائے تو اپنی جگہ کا وہی حق دار ہے۔

مجلس سے رخصت ہوتے وقت اجازت طلب کرنی چاہیے۔ مجلس کے دوران میں ادھر ادھر کی فضول باتوں کے ازالے کے لیے کفارے کی دعا ضرور پڑھ لیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مجلس سے کھڑے ہونے کا ارادہ فرماتے، تو یہ دعا پڑھتے تھے:

«سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ، أَشْهَدُ أَنْ لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ»

''اے اللہ! میں تیری پاکیزگی اور تیری حمد بیان کرتا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تجھ ہی سے میں مغفرت طلب کرتا ہوں اور تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں۔''[1]

گفتگو کے آداب

مجلس کے آداب کے علاوہ والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں کو بات چیت کے آداب بھی سکھائیں۔ انھیں بتائیں کہ گفتگو آرام سے کیا کریں، گفتگو بہت طویل نہ ہو کہ سننے والا اُکتا جائے۔ گفتگو کرنے والے کی گفتگو پوری توجہ سے سُننی چاہیے۔

---

① مسند أحمد: 269/2

بات کرنے والا جن سے مخاطب ہے، ان سب کی طرف توجہ دے۔ مجلس میں موجود لوگوں سے دل لگی اور خوش کلامی بھی کریں تا کہ دلچسپی برقرار رہے۔

مذاق و مزاح کے آداب

بچوں میں مذاق کی بہت عادت ہوتی ہے۔ انھیں بتایا جائے کہ مذاق کے بھی آداب ہیں۔ مذاق میں حد سے نہیں گزرنا چاہیے۔ کسی سے ایسا مذاق ہرگز نہ کریں جس سے اسے تکلیف ہو۔ کسی کے ساتھ برائی کی نیت سے ہرگز مذاق نہ کریں۔ مذاق میں جھوٹی بات نہ کہیں۔

خوشی کے موقع پر مبارک باد دینے کی عادت ڈالیں

بچے کی تربیت، شخصیت سازی اور اس کی معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں جن معاشرتی آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ بچے کو مبارک باد دینے کا عادی بنایا جائے۔ اسے سکھایا جائے کہ اس کا طریقہ اور اصول کیا ہیں۔ ہم اس کی کچھ تفصیل عرض کیے دیتے ہیں۔

مسلمان اپنی زندگی میں جو بھی نیک کام کرتا ہے اس کا پھل اسے ضرور ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اسے اجر و ثواب بھی ملتا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمان کو مبارک باد پیش کرنا، اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا اور اسے خوش کرنا اسلام کی نظر میں بہت بڑی نیکی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ قبول ہوئی تو کسی پکارنے والے نے پکار کر کہا: اے کعب بن مالک! مبارک ہو۔[1]

یہ گویا احادیث کی روشنی میں مبارک باد دینے کا ثبوت ہے۔ سنتِ نبوی ہمیں یہ تعلیم دیتی

---

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب حديث كعب بن مالك، حديث: 4418

ہے کہ ہم ایسے عمدہ کلمات اور بہترین دعاؤں کے ساتھ مبارک باد دیں جن کا سیکھنا مسلمان پر لازمی ہے، اور مناسب وقت پر ان کلمات سے مبارک باد کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ مثلاً:

- ❀ بچے کی پیدائش پر مبارک باد دی جائے۔
- ❀ سفر سے واپس آنے والے کو مبارک باد دی جائے۔
- ❀ کوئی جہاد سے لوٹ کر آئے تو اسے مبارک باد دی جائے۔
- ❀ نکاح اور شادی پر مبارک باد دی جائے۔
- ❀ عید کے موقع پر مبارک باد دی جائے۔

اسی طرح احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کریں۔ مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کسی کو ہدیہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَهَادَوْا تَحَابُّوا»

''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو، اس سے باہم محبت پیدا ہوتی ہے۔''[1]

تحفے تحائف دینا جہاں باہم اُلفت اور پیار میں اضافے کا سبب ہے وہاں باہم حسد و بغض اور کینے کو ختم کرنے کا سبب بھی ہے، چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَهَادَوْا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تُذْهِبُ وَغَرَ الصَّدْرِ»

''باہم تحفے تحائف دیا کرو کیونکہ تحفہ سینے کے کینہ و بغض کو ختم کر دیتا ہے۔''[2]

بیمار پرسی کے آداب

بیمار پرسی کرنا بھی ایک معاشرتی ادب ہے، اس کی طرف بہت زیادہ توجہ دینے اور بچوں کو

---

[1] صحيح الأدب المفرد للألباني: 240/2 [2] مسند أحمد: 405/2

اس کا عادی بنانے کی ضرورت ہے۔ بیمار کی بیمار پرسی کے بھی کچھ آداب ہیں۔ بیمار پرسی ان آداب کا خیال رکھتے ہوئے کرنی چاہیے۔اس طرح بچے میں دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا احساس پیدا ہوگا۔ بچہ جب شروع ہی سے بیمار پرسی کرنا سیکھ جائے گا، اس میں یہ عادت پختہ ہوجائے گی تو وہ محبت، ایثار اور ہمدردی میں کوتاہی نہیں کرے گا۔ اس بارے میں خاص ہدایات یہ ہیں:

- مریض کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھا جائے، البتہ اگر وہ خود ایسا پسند کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔
- مریض کے پاس جا کر اس کے لیے دعا کی جائے۔ اسے مسنون دعائیں پڑھنے کی تلقین کی جائے۔ بیمار کے گھر والوں سے بیمار کی کیفیت پوچھتے رہنا چاہیے۔
- بیمار پرسی کرنے والے کو چاہیے کہ وہ مریض کے قریب ہو کر بیٹھے۔
- اس کی شفایابی اور بہتری کے لیے دعا کرے۔
- بیمار کا اگر آخری وقت ہے تو اسے کلمہ پڑھنے کی تلقین کرے۔

تعزیت کے آداب

تعزیت کے آداب بچے کو سکھائے جائیں۔ تعزیت کرنے کا بہت زیادہ ثواب ہے۔ سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْ مُؤْمِنٍ يُعَزِّي أَخَاهُ بِمُصِيبَةٍ إِلاَّ كَسَاهُ اللهُ سُبْحَانَهُ مِنْ حُلَلِ الْكَرَامَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

”جو مومن مصیبت کے وقت اپنے بھائی سے تعزیت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اعزاز واکرام کی پوشاک پہنائے گا۔“[1]

---

[1] سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في ثواب من عزى مصاباً، حديث: 1601

تعزیت سنت طریقے سے کرنی چاہیے۔ آج کل تعزیت کے جو طریقے رائج ہو گئے ہیں، ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا بچے کو سنت کے مطابق تعزیت کا طریقہ سکھایا جائے۔ تعزیت کے لیے سب سے بہترین الفاظ وہ ہیں جو صحیح بخاری میں سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحب زادی نے آپ کو بلانے کے لیے پیغام بھیجا۔ ان کا بچہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ آپ نے اس پیغام لانے والے سے کہا: ''جاؤ اور ان سے کہہ دو کہ یہ الفاظ کہے:''

«إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطَى وَكُلٌّ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ»

''بے شک اللہ نے جو واپس لے لیا، وہ اسی کا ہے اور جو دیا، وہ بھی اسی کا ہے اور ہر چیز کا اللہ کے ہاں ایک وقت مقرر ہے، لہٰذا تو صبر کر اور اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی اُمید رکھ۔''[1]

چھینک اور جمائی کے آداب

اسلام نے جو آداب سکھانے پر زور دیا ہے، ان میں سے چھینک اور جمائی کے آداب بھی ہیں۔ والدین اور تربیت کرنے والوں کو یہ آداب بچوں کو ضرور سکھانے چاہییں۔ احادیث کی روشنی میں چھینکنے والا اَلْحَمْدُلِلّٰهِ کہے اور سننے والا يَرْحَمُكَ اللّٰهُ کہے۔ پھر چھینکنے والا اس کے جواب میں کہے: يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ. اگر چھینکنے والا الحمد للہ نہ کہے تو اس کا جواب نہ دیا جائے۔

---

[1] صحيح البخاري، الجنائز، باب قول النبي ﷺ: يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه......، حديث: 1284

اس کے ساتھ ہی جمائی کا ادب بھی بچے کو سکھایا جائے۔ جمائی کے وقت آواز بلند کرنا مکروہ ہے۔ جمائی لینا ناپسندیدہ عمل ہے' اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس میں آواز بلند کرنے کو پسند نہیں فرمایا۔

معاشرتی اور اجتماعی آداب اور میل جول کے اصول اور ضابطوں میں سے یہ اہم آداب تھے۔ مسلمان بچہ جب ان آداب کو عملی جامہ پہناتا ہے اور معاشرے میں عملی طور پر ان کا مظاہرہ کرتا ہے تو ایسی صورت میں وہ قابلِ احترام بن جاتا ہے۔ لوگ محسوس کر لیتے ہیں کہ اس بچے کی تربیت اچھے طریق پر کی گئی ہے۔ یہ آداب جب تک اسلامی معاشرے میں جاری وساری رہے اس وقت تک مسلمان طاقت ور رہے، جب انھوں نے ان کو چھوڑ دیا تو وہ کمزور ہو گئے اور ان کی ہوا اکھڑ گئی۔

مذکورہ سب باتیں وہ ہیں جن کو ہمارے اسلاف نے اپنایا تھا اور جن کی بدولت وہ دین و دنیا کی سعادتوں سے ہم کنار ہوئے۔ آج ہم اپنے اسلاف کے برعکس ذلت وپستی کا شکار ہیں، کیوں؟ محض اس لیے کہ ہم نے اپنا رشتہ اپنے مذہب سے بھی توڑ لیا اور اپنے اسلاف کے راستے سے بھی ہٹ گئے۔ اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری عظمتِ رفتہ بحال ہو اور ہم اسلاف کی طرح دنیا میں معزز و کامران ہوں، تو ہمیں بھی وہی طرزِ عمل اپنانا ہوگا جو ہمارے اسلاف اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا تھا، کیونکہ جن اصولوں سے امت کے پہلے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی، بعد کے زمانے کے لوگوں کی اصلاح بھی انھی اصولوں کے ذریعے ہی سے ممکن ہے۔

حقوق العباد

انما
المؤمنون
اخوة

آج کے دور میں کوئی ایسا بھی ہے جسے کسی دوسرے سے گلہ نہ ہو، کوئی رنجش یا شکایت نہ ہو؟ ان شکووں سے رشتوں کی مضبوط دیواروں میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ باہمی تعلق کے گلستان اُجڑ رہے ہیں، بندھن کمزور ہو رہے ہیں۔ رویوں میں سرد مہری کی برف جمتی جا رہی ہے۔ پیشانیاں شکنوں سے بھرتی جا رہی ہیں۔ آپ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر ان ساری کیفیات کا سبب کیا ہے؟ محبت کی مٹھاس کی جگہ تلخی کا زہر کیوں رگوں میں اُتر رہا ہے؟ خوشیاں بانٹنے والے، اب دکھ کا باعث کیوں بن رہے ہیں؟

کچھ تو سوچا ہی ہوگا، آدمی کو اپنی بیماری کی وجہ سمجھ میں آ ہی جاتی ہے۔ یہ کوئی اتنا پیچیدہ مسئلہ نہیں۔ اس کی وجہ بھی بڑی واضح ہے۔ اختلاف، جھگڑے اور رنجش کی ایک ہی وجہ ہوتی ہے، کسی کا حق نہیں دیا ہوتا، یا کسی کا حق چھینا ہوتا ہے۔ آج کے دور میں یہ فلسفہ ہر کسی کے ذہن میں جگہ بنا چکا ہے کہ دوسروں کو حق دینا نہیں اور اپنا حق چھوڑنا نہیں۔ یہی فساد کی بنیادی جڑ ہے۔ بندوں کے حقوق پورے نہیں کیے جائیں گے، ان کے حقوق پامال کیے جائیں

گے، اُن کے حقوق سے روگردانی کی جائے گی تو رشتے اور بندھن کمزور ہی ہوں گے۔

''حقوق العباد'' ایک بندے پر اللہ کی طرف سے عائد کردہ دوسرے بندوں کے جو حقوق ہیں، ان کی ادائیگی کا نام ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ دونوں حقوق ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک حق کی ادائیگی سے دوسرا حق بھی ادا ہو جاتا ہے کیونکہ بندوں کے حقوق ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اور اللہ کا حکم مان کر ہم حقوق اللہ پورے کرتے ہیں۔

ہم حقوق العباد کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟ یہ سوال بھی اپنی جگہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی وجہ یہی سامنے آتی ہے کہ ہم حقوق کے بارے میں علم اور شعور نہیں رکھتے۔ والدین، رشتے داروں، ہمسایوں، یتیموں اور مسکینوں کے ہم پر کیا حقوق ہیں، اس پر ہم واجبی سا علم رکھتے ہیں۔ اسی محدود علم نے لامحدود مسائل اور تلخیوں کو جنم دیا ہے۔

حقوق العباد کیا ہیں؟ آئندہ سطور کا مطالعہ ہم پر بہت اچھی طرح واضح کر دے گا کہ بندوں پر بندوں کے کیا حقوق ہیں اور انھیں کیسے اور کس طرح پورا کرنا چاہیے؟

حقوق العباد کا مطلب ہے، بندوں کے حقوق۔ یعنی ایک بندے پر، اللہ کے دوسرے بندوں کے جو حقوق ہیں، ان کو ادا کرنا۔ وہ حقوق کون کون سے ہیں اور انھیں کس طرح ادا کرنا ہے۔

اس وقت ہمارے معاشرے میں یہ رویہ بڑا عام ہے کہ کچھ لوگ حقوق اللہ کا تو اہتمام کرتے ہیں، لیکن وہ معاملات میں کھوٹے ہیں۔ اخلاق و کردار کی پستی میں مبتلا ہیں اور امانت و دیانت سے عاری ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ ہیں، وہ حقوق اللہ کو تو اہمیت نہیں دیتے، یعنی نماز، روزے وغیرہ عبادات کا تو اہتمام نہیں کرتے، لیکن اخلاق و کردار کے اچھے، معاملات کے کھرے اور امانت و دیانت جیسی خوبیوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

یوں اسلام کا کامل نمونہ اور اسلامی تعلیمات کا کامل پیکر ہمارے معاشرے میں بہت کم افراد نظر آتے ہیں۔ باعتبار اکثریت یا بحیثیت مجموعی ایسے سچے مسلمان نہ ان لوگوں میں نظر آتے ہیں جو دین سے وابستہ ہیں، دینی اقدار و شعائر کے پابند ہیں اور نماز، روزہ، حج وعمرہ وغیرہ عبادات کا اہتمام کرتے ہیں اور نہ ان میں جو دین سے بیگانہ اور دینی اقدار و شعائر سے بے پروا ہیں۔ حالانکہ کامل مسلمان بننے اور اللہ کی رحمت و مغفرت کا مستحق بننے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے حقوق بھی صحیح طریقے سے ادا کیے جائیں اور اسی طرح بندوں کے حقوق میں بھی کوتاہی نہ کی جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ نماز روزے کی پابندی کے باوجود رحمت و مغفرتِ الٰہی

سے محرومی ہمارا مقدر بن جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: ''تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟'' صحابہ نے جواب دیا: اللہ کے رسول! مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس درہم اور مال و متاع نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: نہیں، بلکہ

«إِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِي مَنْ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ وَصِيَامٍ وَزَكَاةٍ، وَيَأْتِي قَدْ شَتَمَ هٰذَا، وَقَذَفَ هٰذَا، وَأَكَلَ مَالَ هٰذَا، وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا، وَضَرَبَ هٰذَا، فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَإِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُقْضٰى مَا عَلَيْهِ، أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ، ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ»

''میری امت کا مفلس شخص وہ ہوگا جو قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوگا۔ دنیا میں وہ نمازیں پڑھتا رہا ہوگا، روزے رکھتا رہا ہوگا اور زکاۃ ادا کرتا رہا ہوگا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان باندھا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔ (یہ سب مظلومین بارگاہِ الٰہی میں اس کے خلاف استغاثہ دائر کریں گے۔ چنانچہ اللہ کے حکم سے) اس کی نیکیاں ان میں تقسیم کر دی جائیں گی حتی کہ اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی لیکن اس کے ذمے ابھی دوسروں کے حقوق باقی ہوں گے، تو مظلومین کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے، (یوں اس کا دامن نیکیوں سے خالی ہو جائے گا، اور اس کے پاس گناہ ہی گناہ باقی رہ جائیں گے، بلکہ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اس پر ڈال دیا جائے گا) پھر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''[1]

اس حدیثِ رسول سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نماز، روزے اور دیگر عبادات کے ساتھ

---

[1] صحیح مسلم، البر والصلة، باب تحریم الظلم، حدیث: 2581

ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی بھی کتنی ضروری ہے۔ ان میں کوتاہی سے ہماری عبادات بھی ضائع ہوسکتی ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہم بندوں کے حقوق بھی سمجھیں اور پھر انھیں صحیح طریقے سے ادا کریں۔

حقوق العباد میں سب سے پہلے رشتے داروں کے حقوق آتے ہیں، اور رشتے داروں میں سب سے مقدم انسان کے والدین ہیں۔ ماں باپ کے حقوق پر الگ مستقل کتاب میں روشنی ڈالی جائے گی، اس لیے یہاں ہم صرف دوسرے رشتے داروں کے حقوق پر ضروری گفتگو کریں گے۔

پہلا حق

رشتے داروں کے حقوق

اسلام نے رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی پر بڑا زور دیا ہے جس کا مطلب ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، ان کی خبر گیری کرنا اوران کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾

''اور رشتے دار کو اس کا حق دو۔''[1]

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ عدل واحسان کا اور رشتے داروں کو دینے کا حکم فرماتا ہے۔''[2]

یہاں اللہ تعالیٰ نے عدل و احسان کے بعد رشتے داروں کو ان کا حق دینے کا حکم دیا، حالانکہ عدل واحسان کے حکم میں رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک بھی آجاتا ہے، اس کے باوجود اللہ نے ان کو دینے کا الگ حکم فرمایا، اس سے مقصود رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی کی اہمیت کو اُجاگر کرنا ہے، اس لیے اس مسئلے کا دوبارہ خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں تقریباً 9 مقامات پر رشتے داروں کو ان کا حق دینے یا ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، علاوہ ازیں بعض اور مقامات پر بھی ضمناً اس کا تذکرہ

[1] بنی إسرائیل 26:17 [2] النحل 90:16

آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بیشتر مقامات پر یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں:

''اور رشتے داروں کو ان کا حق دو۔''

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، ان کے ساتھ امداد اور تعاون کا معاملہ کرنا، ان پر احسان نہیں ہے، بلکہ یہ وہ حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اصحابِ حیثیت پر ان کے رشتے داروں کے معاملے میں عائد کیا ہے، اگر وہ اسے ادا نہیں کریں گے تو وہ عنداللہ ادائیگیٔ حق میں کوتاہی کے مجرم سمجھے جائیں گے۔

بنا بریں اہلِ ثروت و اہلِ خیر کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے اس حق کو اس طرح ادا کریں جیسے وہ نماز ادا کرتے ہیں۔ اللہ کے لیے روزہ رکھتے یا حج وعمرہ کرتے ہیں اور اپنے مالوں میں سے زکاۃ دیتے ہیں۔ ان عبادات کا اہتمام کرکے وہ کسی پر احسان نہیں کرتے، بلکہ اللہ کا شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے انھیں وہ حقوق ادا کرنے کی توفیق دی جو اللہ نے اپنے بندوں پر فرض کیے ہیں۔ اسی طرح رشتے داروں کی امداد کرکے انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے اپنا فرض اور حق ادا کیا ہے، کوئی احسان نہیں کیا ہے۔

اکثر لوگ یہاں کوتاہی کا ارتکاب کرتے ہیں اور رشتے داروں کا حق ادا کرکے ان پر احسان جتاتے اور ان کی عزتِ نفس اور وقار کو مجروح کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی اس نیکی کو بھی برباد کر لیتے ہیں، اسی لیے قرآن نے اہلِ ایمان کو متنبہ کیا ہے:

﴿لَا تُبْطِلُوا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ﴾

''(اے ایمان والو!) احسان جتلا کر اور تکلیف دہ باتیں کرکے اپنے صدقات ضائع مت کرو۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ ایک رشتے دار، باوجود غریب اور ضرورت مند ہونے کے، اپنے کسی مال دار

---

[1] البقرۃ 264:2

رشتے دار سے مالی تعاون لینے سے بالعموم گریز کرتا ہے۔ یوں ہمارے رویے سے کتنے ہی ضرورت مند رشتے دار ہیں کہ وہ ہمارے تعاون سے محروم رہتے ہیں۔ اس چیز نے اسلام کی اس خصوصی تعلیم کے ثمرات وفوائد اور برکات سے معاشرے اور خاندانوں کو محروم کر رکھا ہے۔

صلہ رحمی کے ثمرات وفوائد

اسلام کی یہ تعلیم کہ تم سب سے پہلے اپنے رشتے داروں کا خیال رکھو، اسلام کی ایک نہایت ممتاز اور بہترین تعلیم ہے۔ اگر لوگ صحیح معنوں میں اس پر عمل کریں تو کسی ضرورت مند کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی یا دربدر کاسۂ گدائی لیے پھرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کیونکہ ہر خاندان میں چند افراد ضرور صاحبِ حیثیت ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر خاندان کے لوگ ایک دوسرے کے حالات سے بھی بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اگر ہر خاندان کے اصحابِ حیثیت اپنے اپنے خاندان کے ضرورت مندوں کی خاموشی کے ساتھ آبرومندانہ طریقے سے امداد کر دیا کریں، کوئی بے سہارا یتیم و بیوہ ہو، تو اس کی کفالت کریں، کوئی مریض علاج کرانے سے قاصر ہو، تو اس کے علاج معالجہ کا انتظام کریں، جوان بچیاں گھر میں ہوں، تو ان کی شادیوں میں تعاون کریں۔ کاروباری مشکلات میں مبتلا افراد کے لیے دستِ تعاون دراز کریں، کوئی ارضی وسماوی آفات کی وجہ سے پریشان حال ہو جائے، اس کو از سرِ نو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی سعی کریں۔ اگر ایسا ہونا شروع ہو جائے، تو گداگری کی لعنت کا بھی خاتمہ ہو جائے اور سفید پوشوں کا بھرم بھی قائم رہے۔

اسلام نے رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی پر بہت زور دیا ہے اور اسے صلہ رحمی سے تعبیر کیا ہے، اس کی بڑی فضیلت بتلائی ہے اور اس سے اعراض وگریز کرنے والوں کے لیے سخت وعید بیان فرمائی ہے۔ اس کی ضروری تفصیل حسبِ ذیل ہے:

دُگنا اجر

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«الصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِينِ صَدَقَةٌ، وَهِيَ عَلَى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ: صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ»

''کسی مسکین پر صدقہ کرنا (صرف) صدقہ ہے اور یہی صدقہ کسی (غریب) رشتے دار پر کیا جائے، تو اس کی حیثیت دوگونہ ہو جاتی ہے، ایک صدقے کی اور دوسری صلہ رحمی کی۔''①

ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ایک لونڈی آزاد کر دی اور رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا:

«لَوْ أَعْطَيْتِهَا أَخْوَالَكِ كَانَ أَعْظَمَ لِأَجْرِكِ»

''اگر تو یہ لونڈی اپنے ماموؤں کو دے دیتی، تو تیرے لیے زیادہ اجر کا باعث ہوتا۔''②

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ان دو عورتوں سے فرمایا جنھوں نے پوچھا تھا کہ وہ زکاۃ کی رقم اپنے خاوندوں اور اپنے پاس زیرِ پرورش یتیم بچوں پر خرچ کر لیں، تو جائز ہے؟:

«لَهُمَا أَجْرَانِ: أَجْرُ الْقَرَابَةِ وَأَجْرُ الصَّدَقَةِ»

''ان کے لیے دُگنا اجر ہے۔ رشتے داری (کے حق کی ادائیگی) کا اجر اور صدقے کا اجر۔''③

---

① جامع الترمذی، الزکاۃ، باب ماجاء فی الصدقة علی ذی القرابة، حدیث: 658

② صحیح مسلم، الزکاۃ، باب فضل النفقة و الصدقة علی الأقربین......، 999

③ صحیح مسلم، الزکاۃ، باب فضل النفقة و الصدقة علی الأقربین......، حدیث:1000

رزق میں کشادگی اور عمر میں اضافے کا باعث

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ وَيُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ»

''جسے یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں کشادگی اور اس کی عمر میں اضافہ ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی (یعنی رشتے داروں کے حقوق ادا) کرے۔''[1]

جنت میں داخلے کا سبب

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

أَخْبِرْنِي بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ، فَقَالَ الْقَوْمُ: مَالَهُ مَالَهُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَرَبٌ مَالَهُ؟ تَعْبُدُ اللهَ وَلاَ تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا، وَتُقِيمُ الصَّلاَةَ وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ وَتَصِلُ الرَّحِمَ»

مجھے ایسا عمل بتلائیں جو مجھے جنت میں داخل کر دے؟ لوگوں نے کہا: اسے کیا ہے، اسے کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے کوئی اہم حاجت ہے؟ (پھر اس کے سوال کے جواب میں فرمایا) تو صرف ایک اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کر، نماز قائم کر، زکاۃ ادا کر اور صلہ رحمی کر (یعنی قرابت داروں کا حق ادا کر۔)''[2]

---

[1] صحیح البخاری، الأدب، باب من بسط له فی الرزق لصلة الرحم، حدیث :5986

[2] صحیح البخاری، الأدب، باب فضل صلة الرحم، حدیث :5983

جنت میں جانے سے رکاوٹ کا باعث

سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ»

''قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔''[1]

دنیا ہی میں فوری سزا

سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْ ذَنْبٍ أَجْدَرُ أَنْ يُعَجِّلَ اللهُ لِصَاحِبِهِ الْعُقُوبَةَ فِي الدُّنْيَا مَعَ مَا يَدَّخِرُ لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْبَغْيِ وَقَطِيعَةِ الرَّحِمِ»

''ظلم وزیادتی اور قطع رحمی، دو جرم ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی سزا کے ساتھ، دنیا ہی میں ان کی فوری سزا بھی دے دیتا ہے۔ ان دو جرموں کے علاوہ اور کوئی جرم ایسا نہیں کہ جس کی سزا کا اللہ تعالیٰ اس طرح اہتمام کرتا ہو۔''[2]

رحم (صلہ رحمی) عرش کے ساتھ معلّق، دعا اور بددعا کرتا ہے

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُولُ: مَنْ وَصَلَنِي وَصَلَهُ اللهُ وَمَنْ

---

[1] صحیح البخاری، الأدب، باب إثم القاطع، حدیث :5984

[2] جامع الترمذی، صفة القیمة، باب فی عظم الوعید علی البغی و قطیعة الرحم، حدیث :2511 وسنن أبی داود، الأدب، باب فی النھی عن البغی، حدیث:4902

قَطَعَنِي قَطَعَهُ اللّٰهُ»

''رحم (صلہ رحمی) عرش کے ساتھ معلق کہتا ہے: جو مجھے ملائے، اللہ اسے (اپنے ساتھ) ملائے اور جو مجھے قطع کرے، اللہ اسے قطع کرے۔''[1]

بدسلوکی کے باوجود حسنِ سلوک کی تاکید اور اس کا صلہ

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتے دار ایسے ہیں کہ میں ان سے (صلہ رحمی کرتا) تعلق جوڑتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں، میں ان سے حسنِ سلوک کرتا ہوں اور وہ مجھ سے برا سلوک کرتے ہیں، میں بُردباری اور برداشت سے کام لیتا ہوں، وہ میرے ساتھ جہالت سے پیش آتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا:

''اگر تو واقعی ایسا ہے جیسا کہ تو بیان کر رہا ہے، تو گویا تو ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہا ہے۔ جب تک تیرا طرزِ عمل (ان کے ساتھ) ایسا ہی رہے گا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے، ان کے مقابلے میں ایک مددگار تیرے شاملِ حال رہے گا۔''[2]

حقیقی صلہ رحمی کیا ہے؟

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِىءِ وَلٰكِنِ الْوَاصِلُ الَّذِي إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهُ وَصَلَهَا»

---

① صحيح مسلم، البر والصلة، باب صلة الرحم و تحريم قطيعتها، حديث :2555

② صحيح مسلم، البر والصلة، باب صلة الرحم و تحريم قطيعتها، حديث :2558

''بدلے میں صلہ رحمی کرنے والا، حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے۔ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے، جب قطع رحمی کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرے۔''[1]

صلہ رحمی کی اتنی تاکید کیوں؟

مذکورہ احادیث سے صلہ رحمی کی اہمیت اور تاکید واضح ہے۔ اب اس نکتے پر غور کرنا اور اس کا جائزہ لینا ہے کہ نبئ کریم ﷺ نے اس کی اتنی تاکید کیوں فرمائی ہے؟ حتی کہ رشتے دار بدسلوکی کریں، تب بھی بدسلوکی کے بجائے حسنِ سلوک ہی کا حکم ہے۔ قطع رحمی کے جواب میں قطع رحمی نہیں، صلہ رحمی ہی کرنی ہے، گالی کا جواب گالی سے نہیں، دعا سے دینا ہے اور کانٹے بکھیرنے والوں کو گل دستے پیش کرنے ہیں نہ کہ خاردار جھاڑیاں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑائی جھگڑے کے اسباب زیادہ تر رشتے داروں ہی کے درمیان پائے جاتے یا پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ

- رشتے ناتے بھی زیادہ تر رشتے داروں ہی کے درمیان ہوتے ہیں۔
- جائیدادوں میں اشتراک بھی رشتے داروں ہی کے درمیان زیادہ ہوتا ہے۔
- کاروبار میں حصہ دار بھی زیادہ تر قرابت مند ہی ہوتے ہیں۔
- مل جل کر رہنا بھی زیادہ تر رشتے داروں ہی کے درمیان ہوتا ہے۔

یہ چاروں ہی چیزیں ایسی ہیں جو لڑائی جھگڑے اور تلخی و کشیدگی کا باعث بنتی ہیں۔ جن سے آپ کا میل جول ہو، نہ کاروبار اور جائیداد میں کوئی شرکت ہو اور نہ کسی قسم کا کوئی رشتہ ناتا، تو ظاہر بات ہے ان سے آپ کا جھگڑا ہوگا، نہ کسی بات پر تلخی و کشیدگی۔ تلخیاں اور کشیدگیاں تو ایک جگہ مل جل کر رہنے ہی کی صورت میں ہوں گی یا جائیداد کی وجہ سے ہوں گی یا کاروبار میں

[1] صحيح البخاري، الأدب، باب ليس الواصل بالمكافئ، حديث :5991

شراکت ان کی بنیاد ہوگی یا باہم رشتے ناتے ان کا باعث ہوں گے۔

جب واقعہ یہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے انھی اسباب کی وجہ سے یہ تاکید فرمائی کہ رشتے داروں کے ساتھ جیسے بھی حالات پیش آئیں، یا وہ جس طرح کا بھی معاملہ تمھارے ساتھ کریں، تم نے ہر صورت میں رشتے داری کو نہ صرف یہ کہ برقرار رکھنا ہے بلکہ اس کے تقاضوں کو بھی خوش اسلوبی سے ادا کرنا ہے۔ اگر تم نے صرف انھی رشتے داروں کے ساتھ اچھا رویہ رکھا جو تمھارے ساتھ اچھا رویہ رکھتے ہیں، صرف انھی کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جو تمھارے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں اور انھی رشتے داروں کے ساتھ تعاون کیا جو تمھاری عزت و وقار کو ملحوظ رکھتے ہیں، تو یہ صلہ رحمی نہیں ہے، بلکہ ادلے کا بدلہ ہے، احسان کے بدلے میں احسان ہے اور صلہ رحمی کے جواب میں صلہ رحمی ہے۔ جب کہ اصل صلہ رحمی یہ ہے کہ قطع رحمی کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحمی کی جائے، بدسلوکی کے جواب میں حسنِ سلوک کیا جائے اور رشتے داری کو ہر صورت میں برقرار رکھا جائے اور اس کے تقاضوں کی ادائیگی سے کسی صورت بھی گریز نہ کیا جائے۔

صلہ رحمی کی ایک بہترین مثال اور نمونہ

اس کا بہترین نمونہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ جب ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے تہمت لگائی، تو ان میں چند مسلمان بھی شریک ہو گئے، ان میں سے ایک سیدنا مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہ نہایت غریب تھے، مکے سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی ان کے کفیل تھے۔ جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی کہ ان کی عظیم بیٹی صدیقۂ کائنات کو بدنام کرنے کی مہم میں مسطح بھی منافقین کے ہم نوا ہیں، تو انھیں سخت تکلیف پہنچی اور انھوں نے قسم کھالی کہ آئندہ وہ مسطح کی کفالت نہیں کریں گے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ غصہ فطری تھا اور ان کی قسم بھی اس کا ایک

منطقی نتیجہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فیصلے کو پسند نہیں فرمایا اور قرآنِ مجید کی یہ آیت نازل فرمادی:

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ﴾

”تم میں سے جو اصحابِ حیثیت اور کشادگی والے ہیں، وہ رشتے داروں مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی بابت یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ ان کو کچھ نہیں دیں گے۔ ان کو چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ معاف فرما دے؟“[1]

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت سنی، تو بے اختیار پکار اُٹھے:

«بَلَىٰ وَاللهِ! إِنِّي أُحِبُّ أَنْ يَغْفِرَ اللهُ لِي»

کیوں نہیں، اللہ کی قسم! میں یقیناً پسند کرتا ہوں کہ میرا اللہ میرے گناہ معاف کر دے۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کر کے، سیدنا مسطح رضی اللہ عنہ کی کفالت اسی طرح شروع کر دی جیسے پہلے کرتے تھے۔[2]

رشتے داری کے حقوق ادا کرنے کے ضمن میں یہ واقعہ ہم سب کے لیے ایک مثال اور نمونہ ہونا چاہیے اور ہم سب کا رویہ وہی ہونا چاہیے جو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا۔

کیا ہم سے غلطیاں اور کوتاہیاں نہیں ہوتیں، یقیناً ہوتی ہیں اور ہم اللہ سے یہی چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں معاف فرما دے۔ تو ہمیں بھی عفو و درگزر اور احسان ہی کی روش اپنانی چاہیے نہ کہ اس کے برعکس سختی اور عدمِ احسان کی۔

---

[1] النور 22:24

[2] صحیح البخاری، التفسیر، باب لولا إذ سمعتموه ظن المؤمنون......، حدیث: 4750

دوسرا حق

ہمسایوں کے حقوق

اللہ تعالیٰ سورۃ النساء میں فرماتا ہے:

﴿بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾

"اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ (حسنِ سلوک کرو) اور پڑوسی رشتے دار سے اور اجنبی ہمسائے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے (احسان کا معاملہ کرو۔)"[1]

اس آیت کریمہ میں ہمسایوں کی تین قسموں کا بیان ہے: رشتے دار ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ، عارضی ہمسایہ۔ رشتے دار ہمسایہ تو وہ ہے جس کے ساتھ نسبی اور خاندانی قرابت ہے۔ اس کے ساتھ گویا دوگونہ تعلق ہوا، جس کو ہر موقعے پر ملحوظ رکھنا ہے، اس کے ساتھ حقِ قرابت بھی ادا کرنا ہے اور ہمسائیگی کا حق بھی۔

اجنبی ہمسائے کا مطلب ہے کہ وہ صرف ہمسایہ ہے، اس کے حسب نسب سے آپ آگاہ نہیں۔ آپ اس کے لیے بیگانہ اور اجنبی ہیں اور وہ آپ کے لیے اجنبی اور بیگانہ ہے۔ لیکن وہ آپ کا ہمسایہ ہے، اس لیے اجنبیت اور بیگانگی کے باوجود اس کے ساتھ ہمسائیگی کا حق ادا کرنا ضروری ہے۔

① النساء 36:4

عارضی ہمسائے کا مطلب ہے کہ کوئی شخص آپ کے ساتھ بس میں، ریل میں یا ہوائی جہاز وغیرہ میں ہم سفر ہے، وہ آپ کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا ہے، آپ اپنے حسنِ اخلاق و کردار سے اسے متأثر بھی کر سکتے ہیں اور اپنی بدمزاجی، بداخلاقی اور بدزبانی سے متنفر بھی۔ اس کا حقِ ہمسائیگی آپ صحیح طریقے سے ادا کریں گے تو یقیناً آپ اسے اپنا گرویدہ بنا لیں گے۔

ان تینوں قسم کے ہمسایوں سے اچھا سلوک کرنے کا حکم ہے۔ پڑوسی صرف وہی نہیں ہوتا جس کا گھر آپ کے گھر کے ساتھ یا سامنے ہو، بلکہ اردگرد کے رہنے والے سب پڑوسی ہیں، نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُحِبَّ اللهَ وَرَسُولَهُ أَوْ يُحِبَّهُ اللهُ وَرَسُولُهُ فَلْيَصْدُقْ حَدِيثَهُ إِذَا حَدَّثَ، وَلْيُؤَدِّ أَمَانَتَهُ إِذَا ائْتُمِنَ، وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهُ»

''جسے یہ پسند ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرے، یا اللہ اور اس کا رسول ﷺ اسے پسند کریں، تو اسے چاہیے کہ جب وہ بات کرے تو سچ کرے اور جب اسے امانت پکڑائی جائے تو اسے ادا کرے اور اپنے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔''[1]

سیدنا ابوشریح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ» قِيلَ: وَمَنْ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «الَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ»

''اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتا، اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتا، اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتا۔'' پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! کون مومن نہیں ہو سکتا؟ آپ نے فرمایا:

---

[1] شعب الإيمان للبيهقي، حديث: 1533

"وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہ ہوں۔"[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُحِبَّ لِجَارِهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ»

"اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی بندہ مسلمان نہیں جب تک کہ وہ اپنے ہمسائے کے لیے وہی کچھ نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔"[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَشْبَعُ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَى جَنْبِهِ»

"وہ شخص ایمان دار نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔"[3]

کوئی پڑوسی آپ سے برا سلوک کرے تو صبر کرنا چاہیے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہی ہے۔ پڑوسیوں کے ہاں تحفے تحائف بھیجتے رہنا چاہیے، اس سے محبت بڑھتی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَا نِسَاءَ الْمُسْلِمَاتِ، لَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ فِرْسَنَ شَاةٍ»

"اے مسلمان عورتو! ہرگز کوئی پڑوسن اپنی دوسری پڑوسن کے لیے (معمولی ہدیے کو بھی) حقیر نہ سمجھے، خواہ بکری کے کھر ہی کا کیوں نہ ہو۔"[4]

قریب ترین ہمسائے کا زیادہ حق ہے، لہٰذا چیز پہلے اس کے ہاں بھیجی جائے۔ سیدنا عبداللہ

---

[1] صحيح البخاري، الأدب، باب إثم من لايأمن جاره بوائقه، حديث: 6016

[2] صحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على أن من خصال الإيمان ......، حديث: 45

[3] الأدب المفرد للبخاري، حديث: 112، والمعجم الكبير للطبراني: 3/175، والمستدرك: 4/167، وصححه الألباني في سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 149

[4] صحيح البخاري، الهبة و فضلها والتحريض عليها، باب فضل الهبة، حديث: 2566

بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«خَيْرُ الْجِيرَانِ عِنْدَاللهِ خَيْرُهُمْ لِجَارِهِ»

''پڑوسیوں میں سے بہترین پڑوسی اللہ کے ہاں وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے سب سے بہتر ہے۔''①

پڑوسیوں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید جس قدر اسلام نے کی ہے کوئی اور مذہب ان کے ساتھ حسنِ سلوک پر اتنا زور نہیں دیتا۔ اس کا بخوبی اندازہ آپ صحیح بخاری کی اس روایت سے لگا سکتے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَازَالَ جِبْرِيلُ يُوْصِينِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ»

''جبریل مجھے پڑوسی کے بارے میں مسلسل تاکید و تلقین کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ اُسے یقیناً وارث قرار دے دیں گے۔''②

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے خطاب کر کے فرمایا:

«يَا أَبَا ذَرٍّ! إِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً، فَأَكْثِرْ مَاءَهَا، وَتَعَاهَدْ جِيرَانَكَ»

''اے ابوذر! جب تم شوربے (والا سالن) پکاؤ، تو اس کا شوربہ زیادہ کر لیا کرو اور اپنے پڑوسی کا خیال رکھا کرو۔''③

ان احادیث سے جہاں پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید سمجھ میں آتی ہے وہاں پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے آداب و حدود بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ

- ان کے ساتھ اپنوں کا سا معاملہ کیا جائے، نہ کہ بیگانوں کا سا۔

---

① جامع الترمذی، البر والصلة، باب ماجاء فی حق الجوار، حدیث: 1944

② صحیح البخاری، الأدب، باب الوصاءة بالجار، حدیث: 6015,6014

③ صحیح مسلم، البر والصلة، باب الوصية بالجار والإحسان إليه، حدیث: 2625

- ہمسایوں کا دوست بن کر رہا جائے، نہ کہ دشمن۔
- ان کا ہمدرد اور خیر خواہ ہونا چاہیے، نہ کہ ان کا بدخواہ اور سنگدل۔

اس کے علاوہ یہ حسنِ سلوک کمالِ ایمان کے لیے بھی ضروری ہے اور آخرت میں سرخروئی کے لیے ناگزیر بھی۔

ایک مومن اس طرح ہی اللہ کے ہاں بہتر درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

تیسرا حق

یتیموں اور مسکینوں کے حقوق

یتیم اسے کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہوگیا ہو۔ وہ جب تک جوان نہ ہو جائے یتیم ہے، بالغ ہونے کے بعد وہ یتیم نہیں رہتا۔

اسلامی معاشرہ کسی کو تنہا چھوڑنے کا حکم نہیں دیتا۔ اسلام نے یتیموں کے حقوق کی تقسیم اس طرح کی ہے:

❀ حسنِ سلوک ❀ مالی امداد ❀ معاشی تحفظ

اللہ تعالیٰ سورۃ النساء میں فرماتا ہے:

﴿بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ﴾

"اور ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ (حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔)"[1]

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ انسان کا قریب ترین تعلق ماں باپ سے ہوتا ہے۔ یتیموں سے حسنِ سلوک کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کا ذکر والدین اور رشتے داروں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الضحیٰ میں فرماتا ہے:

﴿فَأَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَأَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝﴾

---

① النساء 36:4

''یتیم پر سختی نہ کرو، اور سائل کو نہ جھڑکو۔''[1]

اس حکم میں یتیم پر سختی کرنے اور اسے جھڑکنے سے منع کیا گیا ہے۔ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا» وَقَالَ بِإِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى

''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں (شہادت والی اور درمیانی انگلی) کی طرح قریب ہوں گے۔''[2]

یہاں یہ بات اہم ہے کہ یتیم کے ساتھ محض زبانی ہمدردی کافی نہیں۔ یتیم کو مالی، اخلاقی امداد اور معاشی تحفظ کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ البقرہ میں فرماتا ہے:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ﴾

''اور وہ آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ ان کی اصلاح کرنا بہت بہتر ہے۔''[3]

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مال داروں کے مال میں سے جو صدقہ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ ان کا احسان نہیں، بلکہ یہ تو حاجت مندوں کا ان پر حق ہے جس کی ادائیگی ان کی اخلاقی، مذہبی اور انسانی ذمے داری ہے۔ صرف فرض صدقات ہی پر حاجت مندوں کا حق نہیں، بلکہ نفلی صدقات میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ فرق یہ ہے کہ فرض صدقات میں حصہ مخصوص ہے، نفلی صدقات میں نہیں۔

صدقات و خیرات نہ دینے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی سخت وعید آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ

---

① الضحیٰ 10,9:93

② صحیح البخاري، الأدب، باب فضل من یعول یتیماً، حدیث: 6005

③ البقرة 220:2

سورۃ الماعون میں فرماتا ہے:

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ؕ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۙ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ؕ﴾

''تم نے دیکھا نہیں اس شخص کو جو آخرت کی جزا سزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔''[1]

یتیموں اور ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کر کے ان پر احسان نہیں جتلانا چاہیے۔ مسلمان تو ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں جیسا کہ نیک لوگوں کے اوصاف کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ○﴾

''اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمھیں صرف اللہ کی رضا مندی کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔''[2]

اب ہم معاشی تحفظ کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر کوئی یتیم صاحبِ جائیداد ہے تو اس کے ولی پر یہ فرض ہے کہ وہ اس کی جائیداد کی دیکھ بھال بحسن وخوبی اُس کے بالغ ہونے تک کرے اور یہ کام بلا معاوضہ کرے۔ البتہ ولی اگر خود غریب ہے تو ضرورت کے مطابق معاوضہ لے سکتا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ یتیم کے مال اور جائداد سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔

---

① الماعون 107:1-3 ② الدھر 76:8، 9

چوتھا حق

ملازمین کے حقوق

معاشرے کے دیگر افراد کی طرح ملازم، خادم یا مزدور کے بھی اس شخص پر حقوق ہیں جس کے تحت وہ کام کر رہا ہے۔ یہ حقوق چار قسم کے ہیں:

- خوش گفتاری
- حسنِ سلوک
- کام میں معاونت
- تحفظِ ملازمت

خوش گفتاری کا مطلب یہ ہے کہ خادم کو اس کے اصلی نام سے پکارا جائے۔ اگر پیار سے کسی اور نام سے پکارنا چاہے تو وہ نام بھی اچھا ہو۔ نام بگاڑ کر نہ لے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کم سن خادم تھے۔ آپ نے دس سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی، آپ فرماتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ''میرے بیٹے!'' جیسے شفقت آمیز نام سے پکارتے تھے۔ ①

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انس رضی اللہ عنہ کو پیار سے اُنیس بھی کہتے تھے۔ ②

دوسرا یہ کہ خادم کا مذاق اڑانا چاہیے نہ اس کی عیب جوئی کرنی چاہیے کیونکہ قرآن وحدیث میں اس کی بڑی وعید بیان کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝﴾

① سنن أبي داود، الأدب، باب في الرجل يقول لابن غيره: يابني ، حديث :4964

② سنن أبي داود، الأدب ، باب في الحلم وأخلاق النبي ﷺ ، حديث :4773

''بڑی تباہی ہے ہر ایسے شخص کی جو عیب ٹٹولنے والا، غیبت کرنے والا ہو۔''①

خوش اخلاقی کا تقاضا یہ ہے کہ مالک کو چاہیے کہ اپنے خادم اور اولاد کو ایک سطح پر رکھے، کیونکہ دونوں اُسی کے زیرِ سایہ رہتے ہیں۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلاَ تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ»

''تمھارے کچھ بھائی ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے ہاتھوں میں دے رکھا ہے، اگر کسی کے ہاتھ میں اللہ نے اس کے بھائی کو دیا ہو تو اسے چاہیے، جو کچھ خود کھائے، وہی اُسے کھلائے، جو خود پہنے اسے پہنائے، اور ان کو اتنے کام کی تکلیف نہ دو کہ ان کے لیے مشکل ہو جائے اور اگر کوئی سخت کام ان پر ڈالو تو تم خود بھی ان کی مدد کرو۔''②

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا أَتَى أَحَدَكُمْ خَادِمُهُ بِطَعَامِهِ فَإِنْ لَمْ يُجْلِسْهُ مَعَهُ فَلْيُنَاوِلْهُ أُكْلَةً أَوْ أُكْلَتَيْنِ، أَوْ لُقْمَةً أَوْ لُقْمَتَيْنِ، فَإِنَّهُ وَلِيَ حَرَّهُ وَعِلاَجَهُ»

''جب تم میں سے کسی شخص کا خادم اس کا کھانا لائے تو اگر وہ اسے اپنے ساتھ نہیں بٹھا سکتا تو کم از کم ایک یا دو لقمے اس کھانے میں سے اسے کھلا دے کیونکہ اس نے پکاتے وقت اس کی گرمی اور تیاری کی مشقت برداشت کی ہے۔''③

① الهمزة 1:104

② صحيح البخاری، الإيمان، باب المعاصی من أمر الجاهلِيَّةِ ولا يكفرّ صاحبها......، حديث: 30

③ صحيح البخاری، الأطعمة، باب الأكل مع الخادم، حديث: 5460

نبیؐ کریم ﷺ اپنے خادموں کے کاموں میں ان کی مدد فرمایا کرتے تھے اور اپنا کام خود کرتے تھے۔

خادم اور نوکر کا یہ بھی حق ہے کہ اسے تحفظِ ملازمت ہو۔ نبیؐ کریم ﷺ نے تمام زندگی کسی ایک خادم کو بھی خدمت سے الگ نہیں فرمایا۔ آپ خادموں کی کوتاہیوں کو نظرانداز کر دیتے تھے۔ دوسری طرف خادموں کی بھی یہ ذمے داری ہے کہ اپنے فرائض کو محنت سے انجام دیں، خیانت نہ کریں۔ جان، مال اور آبرو کی حفاظت آقا اور خادم دونوں کا مشترکہ حق ہے۔

پانچواں حق

حکمرانوں اور رعایا کا حق

کسی ملک کا نظام چلانے اور اس میں امن وسکون قائم کرنے اور رکھنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔

- حکمرانوں کا عادل و منصف اور عوام کے دکھ درد کو سمجھنے والا ہونا۔
- عوام کا اپنے حکمرانوں کے ساتھ تعاون کرنا۔

ان دونوں باتوں کی بنیاد خیر خواہی ہے، یعنی دونوں ہی ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں جیسا کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«الدِّينُ النَّصِيحَةُ»

''دین خیر خواہی کا نام ہے۔''[1]

ایک دوسرے کی خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ حکمران قومی آمدنی کو اپنے اللوں تللوں پر نہ اڑائیں۔ اس سے اپنے اردگرد کے حوالیوں، موالیوں ہی کو نہ نوازیں اور اپنی ہی حفاظت پر قومی وسائل کو بے دردی سے صرف نہ کریں۔ بلکہ صحیح معنوں میں اسے عوام کی فلاح و بہبود پر، ان کی تعلیم و تربیت پر، ان کو عدل و انصاف مہیا کرنے پر، امن وسکون قائم کرنے پر، ان کو علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کرنے پر اور اسی طرح ان کو ان کی ضرورت اور ملکی وسائل کے مطابق ہر طرح کی آسائشیں اور سہولتیں مہیا کرنے پر صرف کریں۔

---

[1] صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة، حديث:55

یہی امانت و دیانت کا تقاضا بھی ہے اور رعایا کے حقوق کی ادائیگی کا طریقہ بھی۔ ایسے ہی عادل حکمرانوں کو قیامت کے دن میدانِ حشر کی ہولناکیوں کے وقت اللہ کے عرش کا سایہ نصیب ہوگا۔

رعایا پر حکمرانوں کا حق یا ان کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ حکمران اگر راہ حق سے ہٹنے لگیں تو انھیں راہ راست کی طرف بلائیں، اور اگر ان کے حکم میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو، تو اسے بجالائیں۔ اسی صورت میں سلطنت کا کام اور انتظام درست رہ سکتا ہے کیونکہ اگر حکمرانوں کی مخالفت اور نافرمانی کی جائے تو بدنظمی پھیل جائے گی اور سب کام بگڑ جائیں گے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی، اپنے رسول ﷺ کی اور حکمرانوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾

’’اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان حکمرانوں کی جو تم سے ہوں۔‘‘[1]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ»

’’مسلمان کے لیے امیر کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔ ان چیزوں میں بھی جنھیں وہ پسند کرے اور ان میں بھی جنھیں وہ ناپسند کرے، جب تک اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اگر اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر ان کی سمع و اطاعت ضروری نہیں۔‘‘[2]

---

① النساء 59:4

② صحیح البخاری، الأحکام، باب السمع و الطاعة للإمام مالم تکن معصیة، حدیث: 7144، وصحیح مسلم، الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء فی غیر معصیة......، حدیث 1839

ایک دوسری حدیث میں سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

«أَرَأَيْتَ إِنْ قَامَتْ عَلَيْنَا أُمَرَاءُ يَسْأَلُونَا حَقَّهُمْ وَيَمْنَعُونَا حَقَّنَا، فَمَا تَأْمُرُنَا؟ فَأَعْرَضَ عَنْهُ، ثُمَّ سَأَلَهُ فَأَعْرَضَ عَنْهُ، ثُمَّ سَأَلَهُ فِي الثَّانِيَةِ أَوْ فِي الثَّالِثَةِ فَجَذَبَهُ الْأَشْعَثُ بْنُ قَيْسٍ، وَقَالَ: «اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا، فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ»

اے اللہ کے نبی! یہ فرمائیے کہ اگر ہم پر ایسے حکمران مسلط ہو جائیں جو ہم سے تو اپنا حق مانگیں لیکن ہمیں ہمارا حق نہ دیں تو اس بارے میں آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے اس شخص سے منہ پھیر لیا۔ اس شخص نے دوسری بار وہی سوال کیا، آپ نے پھر منہ پھیر لیا، پھر پوچھا تو اشعث بن قیس نے سلمہ کو کھینچا پھر کہا: ''ان کی بات سنو اور اطاعت کرو، اس لیے کہ ان کی ذمے داری کا بوجھ ان پر ہے اور تمھاری ذمے داری کا تم پر۔''[1]

گویا حکمرانوں کا رعیت پر یہ حق ہے کہ رعیت اہم امور میں حکمرانوں کے ساتھ تعاون کرے، کیونکہ جو امور حکمرانوں کو سپرد کیے گئے ہیں ان کے نفاذ میں رعیت ان کی مددگار ہوتی ہے، نیز یہ کہ امیر کے کام اور معاشرے کے سامنے اس کی مسئولیت ہر ایک کو معلوم ہونی چاہیے، کیونکہ اگر مسئولیت والے کاموں میں رعایا حکمرانوں کے ساتھ تعاون ہی نہ کرے تو وہ اسے مطلوبہ صورت میں کیسے سرانجام دے سکتے ہیں؟

[1] صحيح مسلم، الإمارة، باب في طاعة الأمراء و إن منعوا الحقوق، حديث: 1846

چھٹا حق

عام مسلمانوں کا حق

مسلمانوں کے بھی باہم ایک دوسرے پر متعدد حقوق ہیں۔ ایک حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ» قِيلَ: مَا هُنَّ؟ يَارَسُولَ اللهِ! قَالَ: «إِذَا لَقِيتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ، وَإِذَا دَعَاكَ فَأَجِبْهُ، وَإِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْ لَهُ، وَإِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللهَ فَشَمِّتْهُ، وَإِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ، وَإِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ»

''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں'' پوچھا گیا، وہ کون کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''جب تو اسے ملے تو السلام علیکم کہہ، اور جب وہ تجھے دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کر، اور جب وہ تجھ سے خیر خواہی طلب کرے تو اس کی خیر خواہی کر، اور جب اسے چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو یرحمك اللّٰہ کہہ، اور جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کر، اور جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے میں شامل ہو۔''[1]

گویا اس حدیث میں مسلمانوں کے باہمی کئی حقوق کا بیان ہے۔

❀ السلام علیکم کہنا سنت مؤکدہ ہے اور مسلمانوں میں انس و محبت پیدا کرنے کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جیسا کہ یہ بات مشاہدے میں آ چکی ہے اور اس پر نبی ﷺ کا یہ ارشاد

[1] صحیح مسلم، السلام، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام، حدیث: 2162

دلالت کرتا ہے:

«لاَ تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا ، وَلاَ تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا ، أَوَ لاَ أَدُلُّكُمْ عَلَى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلاَمَ بَيْنَكُمْ»

''جب تک تم ایمان نہ لاؤ جنت میں داخل نہ ہو گے اور جب تک تم آپس میں محبت نہ کرو گے، مومن نہ ہو گے۔ کیا میں تمھیں ایسی چیز کی خبر نہ دوں کہ جب تم اسے کرو تو آپس میں محبت کرنے لگو؟ آپس میں السلام علیکم کو خوب پھیلاؤ۔''[1]

خود رسول اللہ ﷺ کو جو مسلمان بھی ملتا، آپ اسے پہلے سلام کہتے اور جب بچوں کے پاس سے گزرتے تو انھیں بھی سلام کہتے۔

سلام کا سنت طریقہ یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کہے، تھوڑے لوگ زیادہ لوگوں کو اور سوار پیدل چلنے والے کو سلام کہے۔ لیکن سنت کے مطابق جسے سلام کہنا اولیٰ ہے اگر وہ سلام نہ کہے تو دوسرا کہہ لے تاکہ سلام ضائع نہ ہو، گویا جب چھوٹا سلام نہ کرے تو بڑا کہہ لے اور اگر تھوڑے سلام نہ کہیں تو زیادہ کہہ لیں تاکہ دونوں کو اجر مل جائے۔

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تین چیزیں ہیں جو شخص انھیں اکٹھا کر لے اس کا ایمان مکمل ہو گیا: اپنے آپ سے انصاف کرنا اور سب لوگوں کو سلام کہنا اور تنگی کی حالت میں خرچ کرنا۔[2]

ابتداءً سلام کہنا سنت ہے مگر اس کا جواب دینا فرضِ کفایہ ہے کہ اگر ایک شخص ایک جماعت پر سلام کہے اور ان میں سے ایک شخص سلام کا جواب دے دے تو باقی سب کی طرف سے کافی

---

① صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان أنه لا يدخل الجنة إلا المؤمنون ......، حديث: 54

② صحيح البخاري، الإيمان، باب إفشاء السلام من الإسلام، قبل حديث:28

ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَآ أَوْ رُدُّوهَا ۗ﴾

''اور جب تم کو کوئی سلام کہے تو تم اس سے بہتر الفاظ سے جواب دو یا ویسے ہی لفظ سے جواب دے دو۔''①

سلام کے جواب میں صرف ''کیا حال ہے'' وغیرہ کہہ دینا ہی کافی نہیں، کیونکہ یہ الفاظ نہ تو سلام سے اچھے ہیں اور نہ اس جیسے ہی ہیں۔

❀ ''جب تجھے مسلمان بھائی دعوت دے تو اسے قبول کر''، یعنی جب تجھے اپنے گھر کھانے پر، یا کسی اور کام کے لیے بلائے تو اس کی بات مان لے۔ دعوت کو قبول کرنا سنتِ مؤکدہ ہے، کیونکہ اس میں بلانے والے کے دل کی عظمت ہے اور اس سے محبت اور الفت پیدا ہوتی ہے۔ البتہ شادی کا ولیمہ اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ اس دعوت میں معروف شرائط کا ہونا لازمی ہے، مثلاً: اس میں غیر شرعی حرکات (ویڈیو، میوزک وغیرہ) کا ارتکاب نہ ہو، بے حیائی والے کام (مجرا وغیرہ) نہ ہوں، اسراف نہ ہو اور اسی طرح کی دیگر خرافات نہ ہوں۔ ایسی دعوتوں میں شریک ہونا ضروری نہیں، بلکہ گناہ ہے۔ ہاں، اگر آپ ایسی دعوتوں میں جا کر مذکورہ خرافات وحرکات کو روک سکتے ہیں تو پھر آپ ضرور جائیں۔ ان کے علاوہ عام دعوتوں کو قبول کرنے کا حکم ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّعْوَةَ، فَقَدْ عَصَى اللهَ عَزَّوَجَلَّ وَرَسُولَهُ»

''جس نے دعوت قبول نہ کی اس نے اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔''②

---

① النساء 86:4

② صحيح مسلم، النكاح، باب الأمر بإجابة الداعي إلى دعوة، حديث: 1432

اسی طرح ایک دعوت کسی کارِ خیر یا اس میں معاونت کے لیے ہے، تو اس سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے کی مدد کرنے کی بڑی تاکید ہے جیسے نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ، يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا»

''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔''①

❀ ''جب تجھ سے خیر خواہی طلب کرے تو تُو اس کی خیر خواہی کر''، یعنی جب وہ تیرے پاس آکر اپنے لیے کسی چیز میں تیری خیر خواہی کا طالب ہو تو اس کی خیر خواہی کر کیونکہ یہ بھی دین کا حصہ ہے۔ سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«الدِّينُ النَّصِيحَةُ» قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ: «لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ»

''دین خیر خواہی کا نام ہے'' ہم نے کہا: کس سے؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ سے، اس کی کتاب سے، اس کے رسول سے، مسلمانوں کے حکمرانوں سے اور عام مسلمانوں سے۔''②

یہ خیر خواہی اتنی ضروری ہے کہ اگر وہ خیر خواہی طلب کرنے کے لیے نہ بھی آئے اور صورتِ حال یہ ہو کہ اسے کوئی نقصان پہنچنے والا ہو تو تجھ پر واجب ہے کہ اس کی خیر خواہی کر، اور اس کو صورتِ حال سے آگاہ کر کے اس نقصان سے بچانے کی کوشش کر۔

❀ جب اسے چھینک آئے اور الحمد للہ کہے تو تُو اس کے لیے یرحمك اللہ (اللہ تجھ پر

① صحيح مسلم، البر والصلة، باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم، حديث: 2585

② صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة، حديث: 55

رحم فرمائے) کہے۔ اور یہ اس کے لیے شکر کے طور پر ہوگا کہ اس نے چھینک کے وقت اپنے پروردگار کی تعریف بیان کی۔ البتہ اگر وہ چھینک مارتے وقت الحمد للہ نہ کہے تو پھر اس کے لیے دعائیہ کلمہ یرحمك اللّٰہ کہنا جائز نہیں۔ البتہ جب چھینکنے والا الحمد للہ کہے تو پھر یرحمك اللّٰہ کہنا ضروری ہے اور چھینکنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے جواب میں کہے۔ یہدیکم اللّٰہ و یصلح بالکم ''اللہ تجھے ہدایت دے اور تیرا حال درست کرے۔'' اور جب اسے بار بار چھینکیں آ رہی ہوں تو تین بار یرحمك اللّٰہ کہے اور اس کے بعد چاہے تو جواب دے اور چاہے تو نہ دے۔

❀ ''جب وہ بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کر۔'' مریض کی عیادت کے معنی اس سے ملاقات کرنا ہیں۔ یہ مسلمان بھائیوں کا اس پر حق ہے، لہٰذا مسلمانوں پر عیادت کرنا واجب ہے اور جب مریض سے تمھاری قرابت ہو یا دوستی ہو یا ہمسائیگی ہو تو عیادت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

عیادت مریض اور مرض کے حسبِ حال ہونی چاہیے، کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ بار بار عیادت کے لیے آیا جائے، کیونکہ حالات کا لحاظ رکھنا بہت مناسب ہے۔ جو شخص مریض کی عیادت کرے اس کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ اس کا حال پوچھے اور اس کے لیے دعا کرے اور کشادگی اور امید کا دروازہ کھولے۔ کیونکہ یہ چیز صحت اور شفا کے بڑے بڑے اسباب میں سے ایک سبب ہے اور مناسب یہ ہے کہ اسے ناصحانہ انداز میں توبہ و استغفار کی تلقین کرے۔ مثلاً اسے کہے: مرض سے اللہ تعالیٰ خطائیں دور کرتا ہے اور برائیاں مٹا دیتا ہے اور شاید تو اپنے اس مرض میں کثرتِ ذکر، توبہ و انابت، کثرتِ استغفار اور دعا سے بہت بڑا اجر کما لے۔

❀ ''جب مسلمان بھائی مرے تو اس کے جنازے میں شریک ہو۔'' گویا مسلمان کا یہ حق ہے کہ اپنے بھائی کے جنازے میں شریک ہو اور اس میں بہت بڑا اجر ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلِّيَ فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَ حَتَّى تُدْفَنَ كَانَ لَهُ قِيرَاطَانِ» قِيلَ: وَمَا الْقِيرَاطَانِ؟ قَالَ: «مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيمَيْنِ»

''جس نے جنازے میں شرکت کی اور نمازِ جنازہ پڑھی، تو اسے ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور جو دفن تک ساتھ رہا تو اسے دو قیراط کا ثواب ملتا ہے۔'' پوچھا گیا کہ دو قیراط کتنے ہوں گے؟ فرمایا کہ ''دو عظیم پہاڑوں کے برابر۔''[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا کا مروجہ قیراط نہیں ہے، جو درہم کا بارھواں حصہ ہوتا ہے بلکہ اس سے اجروثواب کی وہ عظیم مقدار مراد ہے جس کا صحیح معنوں میں ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

❀ ایک حق یہ بھی ہے کہ اسے تکلیف پہنچانے سے باز رہے، کیونکہ مسلمانوں کو دکھ پہنچانا بہت بڑا گناہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَّإِثْمًا مُّبِينًا ؏﴾

''اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، جب کہ انھوں نے کوئی جرم نہ کیا ہو، تو یقیناً ان لوگوں نے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اٹھایا۔''[2]

اکثر یوں ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے بھائی پر کوئی تکلیف مسلط کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آخرت سے پہلے دنیا ہی میں اس سے انتقام لے لیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَنَاجَشُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَدَابَرُوا،

---

① صحيح البخاري، الجنائز، باب من انتظر حتى تدفن، حديث: 1325

② الأحزاب 58:33

وَلاَ يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا، الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لاَ يَظْلِمُهُ، وَلاَ يَخْذُلُهُ، وَلاَ يَحْقِرُهُ، التَّقْوٰى هٰهُنَا» وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلاَثَ مِرَارٍ «بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ»

''ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور اشیاء کی قدر و قیمت بتانے میں مبالغے اور دھوکے سے کام نہ لو، آپس میں دشمنی نہ رکھو، نہ تعلقات منقطع کرو۔ کوئی تم میں سے دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو ذلیل کرے، نہ اس کو حقیر جانے۔ تقویٰ اور پرہیز گاری یہاں ہے۔'' اور آپ نے اپنے سینے کی طرف تین مرتبہ اشارہ کیا (یعنی ظاہر میں عمدہ اعمال کرنے سے آدمی متقی نہیں ہوتا جب تک اس کا سینہ صاف نہ ہو۔) آدمی کو یہ برائی ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ مسلمان کا خون، مال، عزت و آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہیں۔''[1]

مسلمان پر مسلمان کے حقوق تو بہت ہیں لیکن جامع معنی کے طور پر وہی بات کہی جا سکتی ہے جو نبی کریم ﷺ کا قول ہے:

''الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ'' مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ جب وہ اخوت کے مقام پر آ گیا تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہر چیز جس میں خیر ہو، وہ اس کے لیے اختیار کرے اور ہر اس چیز سے باز رہے جو اس کو تکلیف پہنچا سکتی ہو۔

---

[1] صحیح مسلم، البر و الصلۃ، باب تحریم ظلم المسلم و خذلہ و احتقارہ ودمہ و عرضہ و مالہ، حدیث:2564

ساتواں حق

غیر مسلموں کا حق

غیر مسلموں میں ہر طرح کے کافر شامل ہیں اور ان کی چار اقسام ہیں:

❀ حربی ❀ مُسْتَأْمِنْ ❀ معاہد ❀ ذمی

حربی کافروں سے مراد وہ کافر ہیں جن سے جنگ و پیکار کا سلسلہ قائم ہو۔ ان کا ہم پر کوئی حق نہیں کہ ان کی حمایت یا رعایت کی جائے۔ مُسْتَأْمِنْ کافر وہ ہیں جو مسلمانوں سے امان مانگیں۔ ان کا ہم پر یہ حق ہے کہ ان کے امن دینے کے وقت اور اس جگہ کا لحاظ رکھا جائے جہاں انھیں امان دی گئی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ﴾

''اور (اے نبی!) اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ چاہے تو اس کو پناہ دیں یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی امن کی جگہ واپس پہنچا دیں۔''[1]

معاہد کافر وہ ہیں جن سے کوئی عہد و پیمان ہو گیا ہو۔ ان کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم ان کا عہد اس مدت تک پورا کریں جو ہمارے اور ان کے درمیان اتفاق سے طے ہوا ہے جب تک کہ وہ اس عہد پر قائم رہیں، اس میں سے کچھ کمی نہ کریں اور نہ وہ ہمارے خلاف کسی کی مدد کریں اور نہ ہمارے دین ہی میں طعنہ زنی کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] التوبة 6:9

﴿إِلَّا الَّذِينَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوٓا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلٰى مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ○﴾

''لیکن جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا ہے پھر انھوں نے تمھارے حق میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے مقابلے میں کسی کی مدد کی تو ان سے (مقررہ) مدت تک ان کا عہد پورا کرو، بلا شبہ اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔''①

نیز فرمایا:

﴿وَإِنْ نَّكَثُوٓا أَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوٓا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ إِنَّهُمْ لَآ أَيْمَانَ لَهُمْ﴾

''اور اگر وہ عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور تمھارے دین میں طعن کریں تو کفر کے ان سرداروں سے جنگ کرو، بے شک ان کی قسموں کا اعتبار نہیں۔''②

رہے ذمی! تو مذکورہ اقسام میں سے ان کے حقوق زیادہ ہیں (ذمی وہ غیر مسلم ہیں جو اسلامی مملکت میں رہتے ہوں) ان کے کچھ حقوق ہیں، تو کچھ ذمے داریاں بھی ان پر عائد ہوتی ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کے ملک میں وہ زندگی بسر کرتے اور ان کی حمایت اور رعایت میں رہتے ہیں، جس کے عوض وہ جزیہ ادا کرتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے حاکم پر واجب ہے کہ ان کے خون، مال اور عزت کے مقدمات میں اسلام کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے، اور جس چیز کی حرمت کا وہ عقیدہ رکھتے ہیں ان میں ان پر حدود قائم کرے اور حاکم پر ان کی حمایت اور ان سے ایذا کو دور کرنا واجب ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا لباس مسلمانوں کے لباس سے الگ ہو، وہ کسی ایسی چیز کا

① التوبة 4:9 ② التوبة 12:9

اظہار نہ کریں جو اسلام میں ناپسندیدہ ہو یا وہ چیز ان کے دین کا شعار (شناختی علامت) ہو، جیسے ناقوس اور صلیب وغیرہ۔ اپنے شعائر دین کا احترام اور دیگر اس قسم کی چیزیں، جن میں تبلیغ ودعوت کا پہلو پایا جاتا ہو، اسلامی ملک میں رہتے ہوئے، ان کو مذکورہ چیزوں کا پرچار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

آجر اور مزدور کے حقوق

اسی طرح مزدور اور آجر کے حقوق ہیں۔ مزدور کی جائز ضروریات سے آجر کو غافل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ خود تو وسیع و عریض کوٹھیوں میں رہے اور مزدور کو سر چھپانے کی جگہ بھی نہ دے۔ یہی نہیں، آجر کو اس کے بچوں کی مناسب دیکھ بھال اور تعلیم کا انتظام بھی کرنا چاہیے۔ اجرت اتنی دی جائے کہ وہ آسانی سے اپنی گزر بسر کر سکے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَعطُوا الْأَجِيرَ أَجْرَهُ، قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ»

''مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔''[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

«ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: رَجُلٌ أَعْطَى بِي ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ»

''قیامت کے دن میں تین آدمیوں سے جھگڑوں گا: ایک تو اس شخص سے جس نے میرے نام پر عہد کیا، پھر اس کو توڑ ڈالا، دوسرا اس شخص سے جس نے آزاد انسان کو

[1] سنن ابن ماجه، الرهون، باب أجر الأجراء، حديث: 2443

فروخت کیا، تیسرا اس شخص سے جس نے کسی مزدور کو مزدوری پر لگایا اور اس سے پورا پورا کام لیا اور اسے اجرت پوری نہ دی۔'' ①

① صحیح البخاری، الإجارة، باب إثم من منع أجر الأجیر، حدیث: 2270

حقوق العباد کی ادائیگی میں معاون چند اہم اُمور

عدل وانصاف

عدل کا مطلب ہے مساوی اور برابر ہونا،اسی لیے آپس کے جھگڑوں کی صورت میں انصاف اور مساوات کی بنیاد پر فیصلے کرنے کو عدل کہا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو عدل اللہ تعالیٰ کی صفتِ عظیم ہے۔کائنات کا یہ نظام،عدل سے وابستہ ہے۔اللہ تعالیٰ سورۃ النحل میں فرماتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ عدل وانصاف کا حکم دیتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں عدل اور احسان دونوں صفات کو دیکھنا پسند کرتا ہے۔دنیا کا ہر شخص عدل کا خواہش مند ہے۔انسان کو قدم قدم پر عدل اور احسان سے واسطہ پڑتا ہے۔ دودھ والے سے آپ امید رکھتے ہیں کہ وہ دودھ میں پانی نہ ملائے۔چیزیں خریدتے وقت آپ امید کرتے ہیں کہ ان میں ملاوٹ نہ ہو اور وزن بھی پورا ہو۔دفتر یا کچہری میں آپ پسند کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ عدل والا معاملہ ہو۔پولیس کا محکمہ بھی نظامِ عدل ہی سے منسلک ہے۔غرض پورا معاشرہ عدل پر قائم ہے۔اللہ تعالیٰ کو عدل کی صفت اس قدر پسند ہے کہ اس وصف کے حامل لوگوں کو اپنا محبوب قرار دیا ہے،ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] النحل 90:16

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾

’’بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔‘‘[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّ ظِلُّهُ : الإِمَامُ الْعَادِلُ»

سات طرح کے آدمی ہوں گے، جن کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں جگہ دے گا، جس دن اس کے سائے کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ (ان میں ایک) عادل حکمران (ہوگا۔)‘‘[2]

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الْمُقْسِطِينَ، عِنْدَ اللهِ، عَلَى مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ، عَنْ يَمِينِ الرَّحْمٰنِ عَزَّوَجَلَّ، وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِينٌ، الَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِي حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيهِمْ وَمَا وَلُوا»

’’عدل کرنے والے، اللہ رب العزت کے پاس نور کے منبروں پر ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ کے پاس ہوں گے، اور اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اہل وعیال کے معاملات میں اور جو کام ان کے سپرد تھے، ان میں عدل کرتے تھے۔‘‘[3]

اس سلسلے میں غور طلب بات یہ ہے کہ عدل کرنا اس وقت بہت مشکل ہو جاتا ہے جب کوئی دشمن سامنے ہو، لیکن اسلام نے اس حالت میں بھی عدل کا حکم دیا ہے۔ اسلام، دشمن قیدیوں

---

[1] الممتحنة 8:60

[2] صحيح البخاری ، الأذان ، باب من جلس فی المسجد ينتظر الصلاة و فضل المساجد، حديث :660

[3] صحيح مسلم، الإمارة، باب فضيلة الأمير العادل و عقوبة الجائر، حديث : 1827

سے بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے۔سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ کیں،تو انھیں یہ ہدایات دی تھیں کہ عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کیا جائے،پھل دار درخت نہ کاٹے جائیں،کھیت نہ جلائے جائیں،جانوروں کو ہلاک نہ کیا جائے،آبادیوں کو ویران نہ کیا جائے۔جو لوگ اطاعت کریں ان کے جان ومال کا اسی طرح احترام کیا جائے جس طرح مسلمان کی جان ومال کا کیا جاتا ہے۔

عدل کا دائرہ بیوی،اولاد، ہمسائے،اعزہ واقارب تک پھیلا ہوا ہے۔سب کے ساتھ ہر معاملے میں عدل اور احسان کا رویہ اختیار کرنا فرض ہے۔

اسلامی عدل کا ایک نمونہ

غسان کے بادشاہ جبلہ نے اسلام قبول کرلیا۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس کے اسلام لانے کی بہت خوشی ہوئی۔وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ کسی غریب آدمی کا پاؤں اس کے کپڑے پر آگیا۔اس پر جبلہ نے ایک زوردار تھپڑ اس غریب کو دے مارا۔اس غریب کا دانت ٹوٹ گیا۔ اس نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔جبلہ نے جرم کا اقرار کیا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے غریب سے فرمایا:اپنا بدلہ لے لو،یعنی اسے بھی اتنے ہی زور سے تھپڑ رسید کرو۔جبلہ یہ فیصلہ سن کر سراسیمہ ہوگیا اور بولا:اس عام سے آدمی کو مجھ جیسے بادشاہ کے برابر کر دیا گیا ہے کہ اُسے مجھ سے بدلہ لینے کا حق حاصل ہوگیا۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:اسلام نے تم دونوں کو برابر کر دیا ہے۔جبلہ نے بدلہ دینے کے لیے ایک روز کی مہلت مانگی۔آپ نے اسے مہلت دے دی۔وہ رات کے وقت چھپ کر بھاگ نکلا اور اسلام سے پھر گیا،مرتد ہوگیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی ذرہ برابر پروا کی،نہ اسلام کو جبلہ کے مرتد ہونے سے کوئی نقصان پہنچا، بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رعایت کرتے تو ضرور اسلام کو نقصان پہنچتا،لوگ خیال کرتے کہ اسلام کمزور کو

طاقت ور سے بدلہ نہیں دلوا سکتا۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے واضح طور پر فرمایا تھا:

«وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلاَ لاَ فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَلاَ لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلاَ أَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلاَ أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلاَّ بِالتَّقْوَى»

''تم سب کا باپ ایک ہی ہے (یعنی تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو۔) خبردار! کسی عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر۔ نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو کسی گورے پر۔ فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔''[1]

اسلام ہر شخص کو اظہارِ رائے کی آزادی دیتا ہے۔ عدل قائم بھی اسی صورت میں رہ سکتا ہے، اگر زبانیں بند کر دی جائیں تو عدل کہاں رہ جائے گا۔

عدل کی ایک اور نادر مثال سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ہے کہ آپ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک شخص نے کہا: ہم آپ کی بات سنیں گے، نہ عمل کریں گے کیونکہ آپ نے اپنے حصے سے زیادہ کپڑا لیا ہے۔ تمام مسلمانوں کے حصے میں ایک چادر آئی تھی، آپ لمبے قد کے ہیں، ایک چادر میں آپ کا لباس نہیں بن سکتا، پھر ایک ہی چادر میں آپ کا لباس کس طرح تیار ہو گیا؟ آپ پہلے اس سوال کا جواب دیں۔ آپ اس وقت ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل پر حکمران تھے۔ انتہائی طاقت ور تھے، چاہتے تو اس آواز کو دبا سکتے تھے، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ وہ اس سوال کا جواب دیں۔ انھوں نے اٹھ کر کہا: میں نے اپنے حصے کی چادر والدِ محترم کو دے دی تھی، اس طرح آپ کا لباس بنا۔

اس قسم کی اور بے شمار مثالیں ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں جب کسی میں کوئی صلاحیت پائی جاتی تھی

[1] مسند أحمد: 411/5

تو یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ وہ کسی غلام کا بیٹا ہے یا کسی اونچے مرتبے والے کا بیٹا ہے، اُسے عہدہ دے دیا جاتا تھا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو اسلامی لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا، جب کہ اس وقت بڑے بڑے صحابہ موجود تھے۔ ان سب کو سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کے زیرِ قیادت روانہ فرمایا۔ یہ شخصی اور اجتماعی عدل کی مثالیں ہیں۔

عدل کے ساتھ ہی احسان کا حکم ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عدل یہ ہے کہ جو کچھ تمھارے ذمے ہے، وہ دے دو، جتنا تمھارا حق ہے، وہ لے لو۔ اور احسان یہ ہے کہ اس سے زیادہ دو جتنا تمھارے ذمے ہے اور اس سے کم لو جتنا تمھارا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

''اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''[1]

اسی طرح سورۃ النحل میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔''[2]

احسان کی مثال یہ ہے کہ چوری کا ملزم سامنے آتا ہے، جرم ثابت ہے، یہاں منصف معافی سے کام نہیں لے سکتا بلکہ اسے سزا دینی ہوگی، یہاں عدل کرنا فرض ہے، لیکن اگر آپ کا اپنا ملازم کوئی چیز چرا لیتا ہے، آپ اسے دیکھ لیتے ہیں تو آپ اسے تنبیہ کر کے چھوڑ سکتے ہیں۔ یہ احسان ہے، آپ چاہتے تو اسے قانون کے حوالے کر سکتے تھے۔

سیدنا صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد میں سو رہا تھا، میرے سر کے نیچے ایسی چادر تھی جس کی مالیت تیس درہم تھی۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور میرے کے نیچے چادر کھینچ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک آدمی نے اُسے پکڑ لیا اور اسے نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کر

---

[1] آل عمران 134:3 [2] النحل 90:16

دیا۔ آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرما دیا۔ میں نبیٔ کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا تیس درہم کے عوض آپ اس کا ہاتھ کاٹ ڈالیں گے؟ ایسا نہ کریں، میں یہ چادر تیس درہم کے بدلے اس کو اُدھار بیچ دیتا ہوں یعنی اس طرح چوری کا جرم ختم ہو جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«فَهَلَّا كَانَ هٰذَا قَبْلَ أَنْ تَأْتِيَنِي بِهِ»

''یہ کام تو نے اسے میرے پاس لانے سے پہلے کیوں نہ کیا؟''①

مطلب یہ کہ تم اس سے احسان کا معاملہ کر سکتے تھے، لیکن اب چونکہ مقدمہ عدالت میں پیش ہو چکا ہے، لہٰذا احسان یعنی معافی کی گنجائش نہیں۔ اپنے معاشرے میں احسان کی مثال یوں ہے کہ ریلوے گارڈ ایک شخص کو غریب سمجھ کر اس سے ٹکٹ کی قیمت نہیں لیتا تو یہ طریقہ عدل کے خلاف ہوگا، اس لیے کہ ریل گاڑی حکومت کی ملکیت ہے۔ گارڈ اجازت کے بغیر کسی کو ایسی رعایت نہیں دے سکتا۔ اگر گارڈ رحم کرنا چاہتا ہے تو قیمت جیب سے ادا کرے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ کسی شخص پر آپ کا قرضہ ہے اور مقروض اسے مقررہ مدت میں ادا نہیں کرتا تو آپ کا حق ہے کہ آپ قرض کا مطالبہ کریں، معاملہ عدالت تک لے جائیں، لیکن اگر آپ اسے مہلت دے دیتے ہیں یا اسے قرض معاف کر دیتے ہیں تو یہ آپ کا احسان ہوگا۔

رزقِ حلال کا اہتمام

رزقِ حلال، حقوق العباد کی ادائیگی کا لازمی جز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس بارے میں ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾

① سنن أبي داود، الحدود، باب فيمن سرق من حرز، حديث: 4394

''اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور عملِ صالح کرو۔''[1]

ایک دوسرے مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ ہی کی عبادت کرنے والے ہو تو جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمھیں کھانے کو عطا کی ہیں، وہی کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔''[2]

کسبِ حلال کا اہتمام اور حرام سے اجتناب اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیک اعمال سے قبل اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی کمائی حرام کی ہو تو اس کے نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لاَ يَقْبَلُ إِلاَّ طَيِّبًا، وَإِنَّ اللهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِينَ، فَقَالَ: ﴿يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ، يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ، يَارَبِّ! يَارَبِّ! وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ! وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ»

''اے لوگو! اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک (مال) ہی قبول کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اُسی بات کا حکم دیا ہے، جس کا حکم اس نے اپنے رسولوں کو دیا ہے۔ (یعنی رزقِ حلال کا) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو۔'' پھر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر کر کے آیا ہو، اس کے بال

[1] المؤمنون 51:23 [2] البقرة 172:2

پراگندہ ہوں اور وہ گرد وغبار سے اَٹا ہوا ہو۔ وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلاتا ہے اور کہتا ہے: اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار! جبکہ اس کا کھانا حرام کا، پینا حرام کا، لباس حرام کا، جس غذا سے اس کا جسم بنا وہ بھی حرام طریقے سے حاصل کی گئی، تو ایسے آدمی کی دعا کیسے قبول ہو!؟[1]

حرام خوری سے اجتناب

انسان اگر چاہتا ہے کہ اس کی عبادات قبول ہوں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی روزی کو پاکیزہ بنائے، کیونکہ حرام خور کی کوئی عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ وہ جنت ہی میں جائے گا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ ، النَّارُ أَوْلٰى بِهِ»

''وہ گوشت جو حرام مال سے پروان چڑھا ہے، جنت میں داخل نہیں ہوگا (اور جو بھی گوشت حرام مال سے پروان چڑھے) اس کے لیے آگ ہی زیادہ لائق ہے۔''[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام سے اجتناب کی بڑی تاکید کی ہے یہاں تک کہ آپ نے حرام سے بچنے کے لیے مشتبہ چیزوں سے بھی بچنے کا حکم دیا ہے۔ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ ، وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ ، وَبَيْنَهُمَا أُمُورٌ مُشْتَبِهَةٌ ، فَمَنْ تَرَكَ مَا شُبِّهَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ كَانَ لِمَا اسْتَبَانَ أَتْرَكَ ، وَمَنِ اجْتَرَأَ عَلٰى

---

[1] المؤمنون 51:23۔ صحيح مسلم ، الزكاة ، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب و تربيتها حديث : 1015

[2] مسند أحمد : 321/3

مَا يَشُكُّ فِيهِ مِنَ الْإِثْمِ أَوْشَكَ أَنْ يُّوَاقِعَ مَا اسْتَبَانَ، وَالْمَعَاصِي حِمَى اللهِ، مَنْ يَرْتَعْ حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكْ أَنْ يُّوَاقِعَهُ»

''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی، اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، جو شخص ان چیزوں کو چھوڑ دے جن کے گناہ ہونے یا نہ ہونے میں شبہ ہے تو وہ ان چیزوں کو تو ضرور ہی چھوڑ دے گا جن کا گناہ ہونا ظاہر ہے۔ لیکن جو شخص شبہ کی چیزوں کے کرنے کی جرأت کرے گا تو قریب ہے کہ وہ ان گناہوں میں بھی مبتلا ہو جائے جو بالکل واضح طور پر گناہ ہیں۔ لوگو یاد رکھو! گناہ اللہ تعالیٰ کی چراگاہ ہے جو (جانور بھی) چراگاہ کے اردگرد چرے گا اس کا چراگاہ کے اندر چلا جانا ناممکن نہیں۔''[1]

سیدنا عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُتَّقِينَ، حَتَّى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهِ حَذَرًا لِمَا بِهِ بَأْسٌ»

''کوئی بندہ اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا، جب تک اندیشے والی چیزوں سے بچنے کی خاطر ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے، جن میں کوئی اندیشہ نہیں۔''[2]

ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ حرام اور مشتبہ چیزوں سے مکمل طور پر اجتناب کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ بلاوجہ کسی سے سوال کرنے سے بھی پرہیز کرے، کیونکہ بلاوجہ سوال کرنے والا قیامت کے روز اس حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا، اسی لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ حقیر سے حقیر پیشہ اختیار کرنا بھی لوگوں سے سوال کرنے سے بہتر ہے۔

---

① صحيح البخاري، البيوع، باب: الحلال بين والحرام بين وبينهما مشتبهات، حديث: 2051

② جامع الترمذي، صفة يوم القيامة، باب علامة التقوى ودع مالا بأس به حذرًا، حديث: 2451، و سنن ابن ماجه، الزهد، باب الورع والتقوى، حديث: 4215

ان احادیث سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام میں کسبِ حلال کی کس قدر اہمیت ہے اور حرام کمائی کی کس قدر مذمت کی گئی ہے کہ کسبِ حرام سے بچاؤ کے لیے اسلام نے مشتبہ چیز یعنی جس کی حرمت واضح نہیں، اس سے بھی پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے اور ناجائز کسی سے سوال کرنے کو بھی سخت ناپسند کیا ہے اور رزقِ حلال کمانے کا درس دیا ہے۔

تجارت اور ہاتھ سے کمانے کی فضیلت

نبیٔ کریم ﷺ نے ہاتھ سے کام کرنے کی نہ صرف ترغیب دی ہے بلکہ اسے بہترین کسب بھی قرار دیا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں نبیٔ کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ»

''کسی انسان نے اس شخص سے بہتر روزی نہیں کھائی جو خود اپنے ہاتھوں سے کما کر کھاتا ہے۔''[1]

ہاتھ سے کمانا، یعنی تجارت کرنا ایک باعزت پیشہ ہے۔ اس پیشے کی فضیلت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ خود نبوت سے قبل بارہ سال تک تجارت کرتے رہے۔ بعض جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی شغل رہا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد مسلمانوں نے اس میدان میں خوب محنت کی اور اس میں نیک نامی بھی پیدا کی۔

تجارت کا پیشہ اگر اسلامی حدود کے اندر رہ کر اختیار کیا جائے تو یہ دنیا میں رزق کی فراوانی کے علاوہ اخروی زندگی میں بھی بلندیٔ درجات پر فائز کر دیتا ہے۔ لیکن افسوس کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو تجارت میں راست بازی اور دیانت داری اختیار کرتے اور دھوکے فریب اور دغا بازی سے اجتناب کرتے ہیں۔ ایسے لوگ واقعی لائقِ تحسین ہیں۔ جو لوگ تجارت

---

[1] صحیح البخاري، البیوع، باب کسب الرجل وعمله بیده، حدیث: 2072

میں ہیرا پھیری اور دھوکا دہی کا برتاؤ کرتے ہیں، ان کا حشر کیا ہوگا؟ جامع ترمذی کی اس حدیث سے واضح ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ التُّجَّارَ يُبْعَثُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا، إِلاَّ مَنِ اتَّقَى اللهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ»

''تاجر لوگ قیامت کے روز گناہ گار کی حیثیت سے اٹھائے جائیں گے مگر ایسا تاجر جو اللہ سے ڈرتا رہا اور نیکی کرتا اور سچ بولتا رہا۔''[1]

لہٰذا ایک تاجر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارت کو غلط اور ناجائز طریقوں سے بچائے، تاکہ اس کا مال پاک ہو اور اس کی روزی حلال کی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ اور طیب روزی ہی قبول کرتا ہے۔ پاکیزہ اور حلال مال سے جو صدقہ و خیرات اللہ کے راستے میں دیا جائے، اللہ اسے قبول کرتا ہے۔ حرام اور مشتبہ مال سے دیا ہوا صدقہ و خیرات بارگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوتا۔ سلف صالحین اور محدثین نے جہاں حدیث کے میدان میں کذاب، دجال اور مجروح راویوں کی نشاندہی کی وہاں تجارت کے میدان میں بھی کمال دیانت داری کا ثبوت دیا اور جھوٹ، دغابازی اور حرام کو قریب تک نہ پھٹکنے دیا۔ امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کے والد محدث اسماعیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے پورے مال میں ایک درہم بھی ایسا نہیں جس کے متعلق حرام کا شبہ بھی ہو۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو شخص حرام مال سے صدقہ دیتا ہے اور خیرات کرتا ہے، وہ اس شخص کی مانند ہے، جو ناپاک کپڑے کو پیشاب سے دھوتا ہے۔ ابن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شبہے کا ایک درہم اس کے مالک کو واپس کر دینا، لاکھ درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

اسی طرح اگر ایک تاجر کی دوسرے تاجر سے شراکت ہے، تو ان میں سے ہر ایک کو چاہیے

---

[1] جامع الترمذی، البیوع، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی ﷺ إیاهم، حدیث : 1210

کہ وہ دوسرے کے مال کو باطل اور ناجائز طریقے سے نہ کھائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾

”اور تم لوگ ایک دوسرے کا مال ناروا طریقے سے نہ کھاؤ۔“[1]

سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَحِلُّ لِامْرِیءٍ أَنْ يَأْخُذَ مَالَ أَخِيهِ بِغَيْرِ حَقِّهِ، وَذٰلِكَ لِمَا حَرَّمَ اللّٰهُ مَالَ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ»

”کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی کا مال دبا لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا مال غصب کرنا حرام قرار دیا ہے۔“[2]

سیدنا ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ ظَلَمَ قِيدَ شِبْرٍ مِنَ الْأَرْضِ طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ»

”جس شخص نے بالشت بھر زمین کسی سے زبردستی چھین لی، قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق اسے پہنایا جائے گا۔“[3]

ان آیات اور احادیث کی روشنی میں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں کیا ہو رہا ہے، ہم ایک دوسرے کی زمین غصب کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ دفاتر میں رشوت کے بغیر کوئی ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔ تاجر حضرات بھی دھوکے اور جھوٹ سے اپنی تجارت چمکاتے نظر

---

① البقرة 188:2

② مسند أحمد: 425/5

③ صحيح البخاري، المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض، حديث: 2453، وصحيح مسلم، المساقاة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، حديث: 1612,1611,1610

آتے ہیں۔ اس طرح ہم دوسروں کے حقوق ادا کرتے ہیں یا غصب کرتے ہیں؟ فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

حسنِ اخلاق کی اہمیت

حقوق العباد میں حسنِ خلق کا معاملہ بہت اہم ہے۔ نبی کریم ﷺ کے حسنِ خلق کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان یوں ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝﴾

''اور بے شک آپ بہت بڑے عمدہ اخلاق پر ہیں۔''[1]

یعنی یہ صفت نبی کریم ﷺ میں بلند ترین سطح پر تھی۔ سیدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ صَالِحَ الْأَخْلَاقِ»

''مجھے بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی تکمیل کروں۔''[2]

اس کا مطلب ہے، حسنِ اخلاق بہت اعلیٰ صفت ہے اور اللہ تعالیٰ یہ صفت اپنے بندوں میں دیکھنا پسند کرتا ہے اور حسنِ اخلاق اللہ کا بہترین عطیہ ہے۔

سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ»

''اعمال کی ترازو میں حسنِ خلق سے زیادہ وزنی چیز کوئی نہیں ہوگی۔''[3]

---

① القلم 4:68

② مسند أحمد: 381/2

③ سنن أبي داود، الأدب، باب في حسن الخلق، حديث: 4799

سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا»

''کامل ترین ایمان ان لوگوں کا ہے جو اخلاق کے لحاظ سے سب سے اچھے ہیں۔''[1]

حسنِ اخلاق میں یہ چیزیں آتی ہیں: خوش گفتاری، حسنِ کردار، خاکساری دوسروں سے خندہ پیشانی سے ملنا اور بات کرنا، نیز حرام سے بچنا، حلال کی طلب، اہل وعیال کے حقوق ادا کرنا اور ان سے حسنِ سلوک کرنا۔ اللہ کی مخلوق کا خوشی اور مصیبت دونوں حالتوں میں خیال رکھنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اِس سلسلے میں ہمارے لیے سب سے اعلیٰ نمونہ ہیں۔ آپ کے قول وفعل میں مکمل ہم آہنگی تھی، جس کام کا دوسروں کو حکم دیا، وہ خود بھی کر کے دکھایا۔ علقمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کیسے کرتے تھے۔ کیا آپ نے (عبادت کے لیے) کچھ ایام خاص کر رکھے تھے؟ جواب میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں ہمیشگی ہوتی تھی۔''[2]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ایک دوسری حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اس طرح ہے:

«أَنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ أَدْوَمُهَا إِلَى اللهِ وَإِنْ قَلَّ»

''اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین عمل وہ ہے جو باقاعدہ کیا جائے، چاہے تھوڑا ہی ہو۔''[3]

خوش خلقی کی ابتدا مسکراہٹ سے ہوتی ہے، جو کہ ایک اچھا عمل ہے اور حدیث میں اسے صدقے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

---

① سنن أبی داود، السنة، باب الدلیل علی زیادة الإیمان ونقصانه، حدیث: 4682

② صحیح البخاری، الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، حدیث: 6466

③ صحیح البخاری، الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، حدیث: 6464

«تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ»

''تیرا مسلمان بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی صدقہ ہے۔''①

سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

جب سے میں مسلمان ہوا ہوں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (اپنے پاس) اندر آنے سے نہیں روکا اور جب بھی آپ نے مجھے دیکھا، آپ مسکرا دیے۔②

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ»

''اچھی گفتگو بھی صدقہ ہے۔''③

مطلب یہ کہ میٹھا لہجہ اختیار کرو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے والا ہر شخص آپ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ اس سے محبت کرتے ہیں۔

سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی یہی خیال کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا۔ اللہ کے رسول! آپ سب سے زیادہ کس سے محبت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ابو بکر سے۔ انھوں نے پھر پوچھا، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نام بتائے۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں اس ڈر سے خاموش ہو گیا کہ کہیں آپ مجھے سب سے آخر میں نہ کر دیں۔④

حسنِ اخلاق میں سے یہ بھی ہے کہ انسان کسی سے ملے یا کسی مجلس میں جائے تو سب سے پہلے سلام کہے، اگر ممکن ہو تو مصافحہ بھی کرے۔ اسی طرح حسنِ خلق میں یہ بات بہت اہم ہے کہ انسان بات بات پر بگڑے نہ، یعنی زیادہ غصہ نہ کرے۔ اگر کسی بات پر غصہ آ جائے تو اسے

① جامع الترمذی، البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف، حدیث: 1956

② صحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل جریر بن عبداللّٰه (رضی اللہ عنہ)، حدیث: 2475

③ صحیح البخاری، الأدب، باب کل معروف صدقة۔ (ذکرہ تعلیقا)

④ صحیح البخاری، المغازی، باب غزوة السلاسل ......، حدیث: 4358

کنٹرول کرنے کی کوشش کرے۔ نبی کریم ﷺ نے غصہ کنٹرول کرنے کا بڑا آسان نسخہ بتایا ہے، آپ کا فرمان ہے:

«إِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ، فَإِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَإِلاَّ فَلْيَضْطَجِعْ»

''اگر تم میں سے کسی کو غصہ آ جائے، جب کہ وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اس طرح کرنے سے غصہ دور ہو جائے تو ٹھیک، وگرنہ لیٹ جائے۔''①

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں ''ایک مرتبہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے کوئی نصیحت فرمائیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لاَ تَغْضَبْ» غصے نہ ہوا کر۔''②

حسنِ اخلاق کے برعکس، بدخوئی ہے۔ بدخوئی سے پیش آنا برائی کی ابتدا ہے۔ خوش اخلاقی کے جتنے فوائد ہیں، بدخوئی کے اتنے ہی نقصانات ہیں۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ بدخوئی سچائی کے اظہار میں رکاوٹ بنتی ہے۔ مثلاً استاذ بدخو ہو تو شاگرد سوال پوچھنے کی ہمت نہیں کرے گا، جب کہ علم تو سوال پوچھنے سے آتا ہے۔ اسی طرح آدمی کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، اگر بدخو ہے تو لوگ اسے پسند نہیں کریں گے۔

خدمتِ خلق

دیکھا جائے تو حقوق العباد کا محور ہی خدمتِ خلق ہے۔ حقوق کی ادائیگی ہی خدمتِ خلق ہے۔ خدمتِ خلق یہ ہے کہ آپ کی ذات سے ہر شخص کو فائدہ پہنچے یہاں تک کہ جانور بھی محروم

---

① سنن أبي داود، الأدب، باب ما يقال عند الغضب، حديث: 4782

② صحيح البخاري، الأدب، باب الحذر من الغضب، حديث: 6116

نہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ﴾

''ساری اچھائی مشرق ومغرب کی طرف منہ کرنے ہی میں نہیں، بلکہ حقیقتاً اچھا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، (اللہ کی) کتاب پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والے کو دے۔ غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکاۃ کی ادائیگی کرے۔''①

اللہ تعالیٰ نے خدمتِ خلق کے طور پر پسندیدہ مال خرچ کرنے کو حقیقی نیکی قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ﴾

''تم نیکی کو ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیز اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرو جسے تم عزیز رکھتے ہو۔''②

نبی کریم ﷺ سراپا ایثار تھے۔ جب آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو انصاری مسلمانوں نے مہاجر مسلمانوں پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اپنے باغات انھیں پیش کر دیے، جن کے پاس دو گھر تھے، ایک گھر کسی مہاجر بھائی کو دے دیا۔ گھر کا نصف سامان اپنے مسلمان بھائی کو دے دیا۔ ایک صحابی نے تو یہاں تک کہہ دیا: بھائی میری دو بیویاں ہیں، میں ان

---

① البقرة 177:2 ② آل عمران 92:3

میں سے ایک کو طلاق دے دیتا ہوں، تم اس سے شادی کرلو۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نبیٔ کریم ﷺ نے مالی امداد کا اعلان فرمایا تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھر کی ہر چیز اُٹھا لائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ گھر کا نصف سامان لے آئے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے تین سو اونٹ مع ساز و سامان دیے۔ اسی طرح دیگر صحابہ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک موقع پر سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنا باغ مسلمانوں کے لیے وقف کرنے کا خیال ظاہر کیا، تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم اسے اپنے ماموؤں کو دے دو۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے لیے میٹھے پانی کا کنواں خرید کر وقف کیا جس پر آپ ﷺ نے انھیں جنت کی بشارت دی۔

موجودہ دور میں خدمتِ خلق کا جذبہ صاحبِ حیثیت لوگوں کے علاوہ عام لوگوں میں بھی بڑھ رہا ہے۔ دینی، رفاہی اور سماجی اداروں کے قیام کے لیے جہاں ملی و قومی درد رکھنے والے اہل ثروت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، وہاں کم وسائل کے لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر انفاق فی سبیل اللہ سے کام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الحاد و گمراہی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ خیر کے انھی کاموں سے کیا جا رہا ہے۔

عیادت و تعزیت کی اہمیت

عیادت (بیمار پرسی) بھی خدمتِ خلق کی ایک قسم ہے۔ کوئی بیمار ہو تو اس سے ملنے کے لیے جانا، اس کا حال پوچھنا، عیادت کہلاتا ہے۔ اس کا بہت زیادہ اَجر ہے۔ اسی طرح تعزیت کرنا بھی خدمتِ خلق ہے۔ دوسروں کے غم میں شریک ہونا دکھ اور مصیبت کے وقت ان کے کام آنا ہی تو خدمتِ خلق ہے۔ تعزیت کے سلسلے میں فوت شدگان کے ورثاء کے پاس جا کر ان کو تسلی دی جائے، لیکن اظہارِ ہمدردی کے بعد واپس آ جانا چاہیے۔ کھانے پینے کے لیے وہاں رکنا نہیں چاہیے۔ حقوق العباد میں خدمتِ خلق اہم ترین رکن ہے۔

پابندیٔ عہد

عہد کی پابندی بھی حقوق العباد میں شامل ہے۔ عہد کی پابندی صفتِ الٰہی ہے۔ سورۃ الزمر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ﴾

''اللہ وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔''[1]

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ عہد کو پورا کیا کریں، قرآن کریم کے کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اس کا تاکیدی حکم بھی دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا﴾

''اور وعدہ پورا کرو، بے شک وعدے کے متعلق سوال کیا جائے گا۔''[2]

نبی کریم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں عہد کی پابندی کس طرح پوری کی، دنیا کے انسان اس کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جبکہ مسلمان اور کفارِ مکہ صلح کی شرائط طے کر رہے تھے، ابو جندل نامی ایک صحابی جنھیں مشرکینِ مکہ نے مسلمان ہونے کے سبب قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دے رہے تھے، ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں لیکن کسی نہ کسی طرح بھاگ کر آئے اور سب کے سامنے گر پڑے۔ مشرکین کی طرف سے سہیل بن عمرو کہنے لگا: معاہدۂ صلح کی شرائط کے مطابق آپ ابو جندل کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ ابو جندل کو مشرکینِ مکہ نے اس قدر مارا تھا کہ ان کے جسم پر ضربوں کے نشانات موجود تھے۔ وہ مجمع کو اپنے زخم دکھلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: اے اصحابِ محمد! میں اسلام لا چکا ہوں اور اس کی سزا میں مبتلا ہوں، کیا مجھے پھر کافروں کے حوالے کر دیا جائے گا؟

---

[1] الزمر 20:39 [2] بنی إسرائیل 34:17

مسلمان اس منظر سے تڑپ اٹھے۔ ابوجندل سیدنا عمر فاروق اور دیگر چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فریاد کررہے تھے اور سب کے دل جوش سے لبریز تھے۔ لیکن دوسری طرف معاہدے پر دستخط ہوچکے تھے۔ مسلمانوں کو ایفائے عہد کی ذمہ داری کا احساس تھا۔ ان حالات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور فرمایا: ابوجندل! صبر وضبط سے کام لو، اللہ تمھارے اور دیگر مظلوموں کے لیے راستہ نکالے گا، صلح کا معاہدہ اب طے ہو چکا ہے، اس لیے ہم تم کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے، کیونکہ اگر تم کو ساتھ لے جائیں گے تو یہ معاہدے کی خلاف ورزی اور بدعہدی ہوگی جسے ہم پسند نہیں کرتے، لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اطاعت شعار صحابہ کے سامنے ابوجندل رضی اللہ عنہ کو پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایفائے عہد کی خوبی کو دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

> قیصرِ روم نے اپنے دربار میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے، جب کہ سیدنا ابوسفیان ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اسلام اور مسلمانوں کے شدید دشمن تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کیں۔ اُن میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عہد شکنی کرتے ہیں؟ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: وہ بدعہدی اور وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ یہ سن کر قیصرِ روم نے کہا: تم نے درست کہا، اللہ کے رسول بدعہدی کے مرتکب نہیں ہوتے۔ [1]

اس قسم کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اخوت ومساوات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں اخوت کا جذبہ بیدار فرمایا۔ یہ جذبہ موجود ہو تو حقوق العباد

---

[1] صحیح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ ......، حديث: 7

کی ادائیگی میں بہت آسانی رہتی ہے۔ آپ نے مسلمانوں میں رحم کا جذبہ پیدا کیا۔ اس جذبے کی موجودگی میں حقوق العباد کی ادائیگی میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَرْحَمُ اللهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ»

''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، ارْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ»

''رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''[2]

اخوت کی طرح مساوات بھی حقوق العباد میں شامل ہے۔ سورۃ الحجرات میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ﴾

''اے انسانو! تم سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا فرمایا اور تمھیں خاندان خاندان، قبیلہ قبیلہ اس لیے بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو بلاشبہ اللہ کے نزدیک سب سے عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔''[3]

مطلب یہ کہ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ فضیلت اگر ہے تو تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ ہر مسلمان کا

---

[1] صحیح البخاری، التوحید، باب قول اللہ تبارك و تعالٰی ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ......﴾ حدیث: 7376

[2] جامع الترمذی، البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الناس، حدیث: 1924

[3] الحجرات 13:49

دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ اسے سماجی معاشرتی زندگی میں مساوی رتبہ دیا جائے اور اقتصادی میدان میں آگے بڑھنے کا مساوی موقع دیا جائے۔

احساسِ فرض کی اہمیت اور وقت کی قدر و قیمت

اسلامی معاشرے میں فرض کے احساس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔فرض کا احساس جب نہیں ہوتا تو ان گنت خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔اس بنا پر ایک سرکاری ملازم کے لیے خوش اخلاقی ہی کافی نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دیانت دار بھی ہو، وقت کا پابند بھی ہو، ڈیوٹی کے اوقات کو خوش گپیوں میں نہ بسر کرتا ہو۔ بدقسمتی سے وقت کی پابندی جس قدر اہم ہے، مسلمان اس سے اسی قدر بے پروا ہیں۔سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مِنْ حُسْنِ إِسْلاَمِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لاَ يَعْنِيهِ»

''آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بیکار باتوں کا مشغلہ ترک کر دے۔''[1]

ہمارے دفاتر میں یہ چیز عام نظر آئے گی۔ملازم حضرات خوش گپیوں میں مصروف ہوں گے یا ڈیوٹی سے غائب ہوں گے۔کسی کو ذمے داری کا احساس نہیں ہے، حالانکہ یہ بڑا سنگین معاملہ ہے۔قیامت کے دن اس کی باز پرس ہوگی۔صحیح بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»

''تم میں سے ہر ایک رکھوالا اور نگہبان ہے اور قیامت کے دن اس سے اس کے ماتحتوں کے متعلق سوال ہوگا۔''[2]

---

① جامع الترمذی ، الزهد ، باب حديث من حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه، حديث:2317، و سنن ابن ماجه، الفتن ، باب كف اللسان في الفتنة ، حديث :3976

② صحيح البخاري ، الجمعة ، باب الجمعة في القرى والمدن ، حديث :893

ہر آدمی کے ذہن میں یہ بات ہونی چاہیے کہ قیامت کے دن اس نے اللہ کے سامنے پیش ہو کر اپنا حساب دینا ہے، لہٰذا اگر وہ دفتری اوقات میں کام کرنے سے جی چرائے گا تو اللہ کو کیا جواب دے گا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں احساس ذمے داری بہت زیادہ تھا۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوتاہی میں مبتلا ہوں اور قیامت کے دن ان سے سوال کیا جائے۔

ایک بدو امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور سوال کرنے لگا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے گھر میں روٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ بدو مایوس ہو کر چل دیا۔ وہ کہتا جا رہا تھا: اللہ کی قسم! قیامت کے روز اللہ تعالیٰ آپ سے میرے متعلق ضرور باز پرس کرے گا۔ اُس کی بات سن کر امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ رو پڑے اور اتنا روئے کی ہچکی بندھ گئی۔ پھر بدو کو بلایا اور اپنے غلام کو آواز دی کہ میری زِرہ لے کر آؤ۔ غلام زرہ اُٹھا لایا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے وہ زرہ بدو کو دیتے ہوئے کہا: دیکھو یہ زرہ تم سے کوئی ٹھگ نہ لے۔ یہ بڑی قیمتی زرہ ہے۔ اس سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر اڈتی ہوئی پریشانیوں کو بارہا مرتبہ دور کیا ہے۔ یہ دیکھ کر آپ کا غلام عرض کرنے لگا:

امیر المومنین! بدو کے لیے بیس درہم کافی تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر یہ دنیا میرے لیے سونا اور چاندی بن جائے اور میں سب کی سب اس شخص کو دے دوں تب بھی مجھے کوئی کوفت نہ ہوگی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس شخص کے بارے میں جو میرے سامنے کھڑا ہے، باز پرس کی تو میں کیا جواب دوں گا؟

ہر صاحبِ اختیار شخص کو اس واقعے سے عبرت پکڑنی چاہیے اور اللہ سے ڈرتے ہوئے اور اپنی آخرت کی فکر کرتے ہوئے ذمے داری کا احساس کرنا چاہیے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبے میں یہ بھی فرمایا تھا: جب تک میں اللہ اور اس

کے رسول ﷺ کی اطاعت کروں، تم بھی میری اطاعت کرنا اور جب میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو تم میری اطاعت نہ کرنا۔ مطلب یہ کہ سربراہِ مملکت ایمان دار ہو تو اس کی اطاعت کرنی چاہیے اور اگر بددیانت، فاسق اور فاجر ہو تو ایسے حکمران کے خلاف کلمۂ حق کہنا افضل جہاد ہے۔ ایسے حاکم کا احتساب ہونا چاہیے۔

اچھی حکومت کا مطلب باکردار سرکاری ملازمین ہیں۔ سرکاری ملازمین کو بگاڑنے یا سنوارنے میں اعلیٰ حکام کے علاوہ عوام کا بھی بہت دخل ہے۔ اس معاملے میں سب سے خطرناک کام رشوت ہے۔ عوام رشوت دے کر اپنے کام کراتے ہیں اور بددیانت ملازمین رشوت لیے بغیر کام کرتے نہیں۔ اس سے معاشرے میں بگاڑ کی خوفناک صورت پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق غصب کیے جاتے ہیں۔ افسروں کو دیے جانے والے تحائف بھی رشوت کی ایک قسم ہیں۔ البتہ جائز سفارش کی گنجائش ہے۔ جائز سفارش کی صورت یہ ہے کہ جس کی سفارش کی جائے، اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے مطالبے کو خود حکام تک نہ پہنچا سکے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ»

''اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے، جب تک کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی امداد میں لگا رہتا ہے۔''[1]

مختصر یہ کہ عوام کو سرکاری ملازمین کو رشوت دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ سرکاری عہدے داروں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی روزی کو حرام نہ کریں۔ سفارش کی جائے تو وہ جائز ہو۔

---

[1] صحيح مسلم ، الذكر و الدعاء ، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن، وعلى الذكر ، حديث: 2699

تاجر کے فرائض

اسلام نے جہاں تجارت کی حوصلہ افزائی کی ہے، وہاں تاجر کے ذمے کچھ فرائض بھی عائد کیے ہیں کہ وہ تجارت کو شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے فروغ دے اور ہر ایسے طریقے سے اجتناب کرے جو حرام کی طرف لے جاتا ہے۔ مثلاً ناپ تول میں کمی، ہیرا پھیری اور دغا بازی سے پرہیز کرے۔ جو لوگ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، ان کے بارے میں سخت وعید آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝﴾

''تباہی ہے ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے، جو لوگوں سے ناپ تول کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ تول کر دیں تو کم دیں۔''①

اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں کہ کسی کے حق کی ادائیگی میں کمی کی جائے اور اپنے حق کے حصول میں ذرہ بھر بھی تجاوز کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ملاوٹ کرنا بھی سخت جرم ہے۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کی قوم ناپ تول میں کمی کرتی تھی، تو اللہ کا عذاب ان پر نازل ہوا اور قوم کو زلزلے نے آ لیا اور وہ تباہ ہوگئی۔ دراصل ملاوٹ کرنے والا دوسروں کو دھوکا دیتا ہے اور ان کا حق مارتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سخت الفاظ فرمائے ہیں۔

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ نے اناج کا ایک ڈھیر دیکھا۔ آپ نے ڈھیر میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو آپ کی انگلیوں کو تری محسوس ہوئی۔ آپ نے ڈھیر کے مالک کو مخاطب کر کے پوچھا: ''یہ کیا

---

① المطففین 83:1-3

ہے؟'' اس نے جواب دیا:

اللہ کے رسول! اس پر بارش پڑ گئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''پھر تو نے اس بھیگے ہوئے اناج کو اوپر کیوں نہ رکھا کہ لوگ دیکھ لیتے!؟''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا»

''جس شخص نے ہم کو دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں۔''[1]

خود رسول اللہ ﷺ بھی تجارت کے پیشے کو بڑا پسند فرماتے تھے اور تاجروں سے تجارت کے متعلق گفتگو کرتے رہتے تھے اور آپ ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت لے کر ملک شام کی طرف تشریف لے گئے۔ اور اس امانت و دیانت سے کام کیا کہ بڑے بڑے تاجر بھی حیران رہ گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ رسول اللہ ﷺ اپنے نفع سے زیادہ خریداروں کے حقوق کا خیال رکھتے تھے، جس سے آپ کی خریداری بھی بڑھ گئی اور جو فائدہ پہلے ہوا کرتا تھا، اس سے بہت زیادہ فائدہ ہوا۔

نبیٔ کریم ﷺ نے تجارت میں جہاں امانت و دیانت اور سچائی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا وہاں آپ اخلاقِ حسنہ کے زیور سے بھی آراستہ رہے۔ کسی خریدار یا دکاندار کو اپنی زبان سے تکلیف دی اور نہ ہی ہاتھ سے اذیت پہنچائی۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو کسی تاجر کی تجارت کے فروغ کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور حقیقی مسلمان بھی وہی ہے جو ان عمدہ اوصاف سے موصوف ہو جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبیٔ کریم ﷺ سے سوال کیا: کون سا مسلمان بہتر ہے؟ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم، الإیمان، باب قول النبی ﷺ : من غشنا فلیس منا، حدیث: 102,101

«مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ»
''جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''[1]

① صحیح مسلم ، الإیمان ، باب بیان تفاضل الإسلام، وأی أموره أفضل، حدیث:40

تلاش حق سیریز

تلاشِ حق میں سرگرداں لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے
انتہائی مستند، جامع اور دل پذیر کتابوں کا سیٹ، اردو میں پہلی بار

خود پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے!

* توحید اور ہم
* رحمتِ عالم ﷺ
* قرآن کی عظمتیں اور اس کے معجزے
* اسلام کی امتیازی خوبیاں
* اسلام کے بنیادی عقائد
* اسلام میں بنیادی حقوق
* اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات
* اسلام پر 40 اعتراضات کے عقلی و نقلی جواب
* اسلام ہی ہمارا انتخاب کیوں؟
* میں توبہ تو کرنا چاہتا ہوں لیکن!
* جنت میں داخلہ، دوزخ سے نجات

دار السلام
DARUSSALAM

راہ حق سیریز

مسلمانوں کی عملی زندگی میں مسنون انقلاب برپا کرنے والی کتب کا دعوتی، مستند اور جامع سیٹ

خود پڑھیے اور دوسروں کو پڑھائیے!

* ترجمہ و تفسیر تیسواں پارہ
* تجلیات نبوت
* ارکانِ اسلام و ایمان
* مسنون نماز اور روزمرہ کی دعائیں
* اسلام کے احکام و آداب
* فکر و عقیدہ کی گمراہیاں اور صراطِ مستقیم کے تقاضے
* اسلامی آدابِ معاشرت
* حقوق و فرائض
* انسان...... اپنی صفات کے آئینے میں
* دعوتِ حق کے تقاضے
* لباس اور پردہ

دارالسلام
DARUSSALAM

حقوق و فرائض

پُرامن اور خوبصورت معاشرے کی بنیاد

آج ہر شخص پریشان ہے۔ کسی کو سکون میسر نہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہم اپنے مسائل حل کرنے کے لیے دین قیم سے رہنمائی کی روشنی نہیں لیتے بلکہ ان مادہ پرست لوگوں کے ٹمٹماتے چراغوں کے گرویدہ ہیں جو اسلام کے دشمن اور مسلمانوں کے قاتل ہیں۔ اگر ہمیں اپنے موجودہ مصائب ومکروہات سے نجات پانی ہے اور ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھنا ہے تو ہمیں صرف قرآن وسنت ہی کے دار الشفاء سے وابستہ ہونا پڑے گا۔

اسلام نے فرد اور معاشرے کی اصلاح، استحکام، فلاح و بہبود اور امن وسکون کے لیے ہر شخص کے حقوق وفرائض مقرر کر دیے ہیں۔ اگر ہم دینی تعلیمات کے مطابق ایک دوسرے کے حقوق خوش دلی سے پورے کرنے لگیں تو نہ صرف بہت سے مفسدات اور خرابیوں کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ ہمارا معاشرہ سکون وطمانیت کی پیاسی مادہ پرست دنیا کے لیے بھی اُمید اور آرام کی سبق آموز بشارت بن جائے گا۔

حقوق وفرائض کی اہمیت کے پیشِ نظر دار السلام نے قرآن وسنت کی روشنی میں حقوق سیریز کی متعدد کتابیں شائع کی ہیں جن کے مؤلف نامور عالم دین محترم حافظ صلاح الدین یوسف ﷾ ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی حقوق سیریز کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب خود بھی پڑھیے اور اپنے حلقۂ اثر کے احباب کو بھی اس کے مطالعے کی دعوت دیجیے۔ اس طرح فرض شناسی کا شعور اور نیکی کا نور دور تک پھیلتا چلا جائے گا۔

دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ہیوسٹن • نیو یارک
DARUSSALAM
ISBN: 9960-9822-6-2
9 789960 982267
PRINTED IN CHINA - 12